راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

جولائی 2016ء

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

کبھی کسی ادبی گروہ بندی کا حصہ نہیں بنا ہوں

نامور شاعر، کالم نویس اور پبلشر خالد شریف سے عامر بن علی کی گفتگو

مجھے زندگی کا پہلا چائنیز کھانا فراز صاحب نے کھلایا

خالد شریف اُردو شعروادب کا ایسا نام ہے جن کے ذکر کے بغیر ہمارے عہد کا ادبی تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔ آپ نا صرف نامور شاعر و ادیب ہیں بلکہ کتابوں کے عاشق بھی ہیں۔ کتاب سے اسی عشق کی بنیاد پر آپ نے سول سروس چھوڑ کر اشاعتی ادارہ قائم کیا جو کہ ''ماورا'' کے نام سے آج بھی پاکستانی عوام کی علمی و ادبی تربیت کے لیے اعلیٰ معیار کی کتب شائع کر رہا ہے۔ لاہور شہر کے مال روڈ پر واقع اسی اشاعتی ادارے کے دفتر میں ان سے گزشتہ دنوں چائے پر ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو ''ارژنگ'' کے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر ہے۔

ارژنگ: پاکستانی نوجوانوں کے لیے عموماً یہ خوبصورت خواب ہوتا ہے کہ وہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے بیوروکریٹ بن جائیں۔ جبکہ شاعروں کو نکمے اور مفلوک الحال افراد کے طور پر نہ صرف میڈیا پیش کرتا ہے بلکہ عوامی رائے بھی کم و بیش یہی ہے۔ آپ اچھے خاصے ڈپٹی کمشنر اور وہ بھی انکم ٹیکس جیسے دبنگ محکمے کے۔ پھر کیا ہوا کہ افسری کو لات مار کر شاعری اور کتابوں کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا؟

خالد شریف: وہ یوں تھا کہ پہلا ماسٹرز میں نے اکنامکس کے شعبے میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے کیا۔ ان دنوں ہمارے گھر کے معاشی حالات بس ایسے ہی تھے جیسے ہمارے ہاں اکثر و بیشتر لوگوں کے ہوتے ہیں۔ میں چھ بہنوں کا اکیلا بھائی تھا۔ والد صاحب کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی، کوئی خاص کام وہ نہیں کر رہے تھے۔ نرینہ اولاد ہونے کے ناتے گھر کی ذمہ داری مجھے خود پر محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے نوکری کرنا وقت کی ضرورت تھی۔ انھی دنوں چانس ملا، مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور کامیاب بھی ہو گیا۔ مجھے انکم ٹیکس کا محکمہ دیا گیا اور پہلی تعیناتی فیصل آباد

''ماورا'' آج بھی پاکستانی عوام کی علمی و ادبی تربیت کے لیے اعلیٰ معیار کی کتب شائع کر رہا ہے

معروف شاعرہ

لبنیٰ صفدر

کے مقبول عام شعری مجموعوں کے بعد تازہ شعری مجموعہ

تم محبت کا استعارہ ہو

نہایت منفرد اور دیدہ زیب انداز میں اشاعت کے آخری مراحل میں

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 - 0321-4489310
nastalique786@gmail.com

نامور شاعرہ، سفرنامہ نگار اور افسانہ نویس

نیلما ناہید درانی

کا ادبی سفر

معروف شاعرہ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

کے شعری مجموعے

کہیں پہ گرد کہیں پر ہوا بناتی ہوں
میں خود کو اب تو بس اپنے سوا بناتی ہوں
بکھر گئے تھے کسی نام کے حروف کہیں
اب ان کو جوڑ کے اک آئینہ بناتی ہوں
اجالتا ہے یہ تاریکیاں میرے دل میں
تمھاری یاد کو ہر پل دیا بناتی ہوں
جب اپنے اشک چھپاتی ہوں مسکراہٹ سے
تو اپنے درد کو اپنی دوا بناتی ہوں
تراش کر کسی پتھر کے ایک پیکر کو
کمال عشق سے اس کو خدا بناتی ہوں
کہ خواب میں رہے تا دیر گفتگو تجھ سے
ذرا سی بات کو میں واقعہ بناتی ہوں
سنا تھا میں نے جو شاہین ایک لمحے کو
اس ایک لمحے کو اپنی صدا بناتی ہوں

الحمد پبلی کیشنز، ... لاہور ● تخلیق مطبوعات، غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

نامور شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس اور انشائیہ نگار

محمد ممتاز راشد لاہوری کی نئی کتب

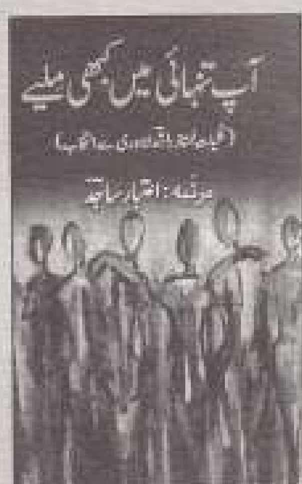

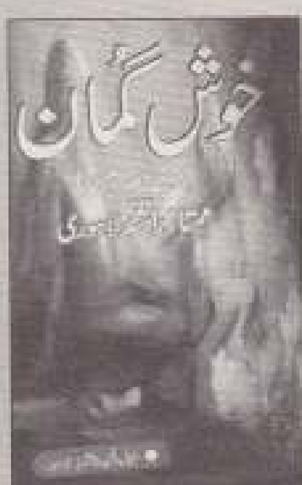

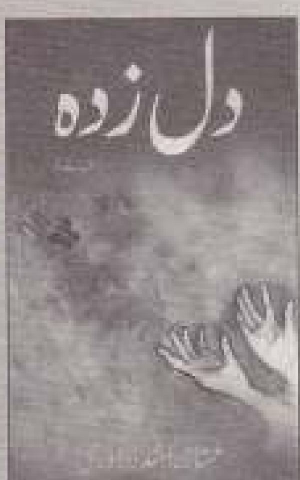

ملنے کا پتہ: "ماورا" شاہراہ قائد اعظم لاہور

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly
Arxang
Lahore

پاکستان اور دنیا بھر کے اہل ادب کا ترجمان میگزین

اعلیٰ ادبی وصحافتی روایت کا امین

مدیر اعلیٰ ❁ عامر بن علی مدیر ❁ حسن عباسی

ادبی سلسلے

- حمد و نعت
- شاعری
- افسانے
- تبصرہ کتب
- سفرنامے
- انشائیے
- تنقید وتحقیق
- آپ بیتی
- شعری گوشے
- تراجم
- نامہ ہائے احباب
- عالمی شاعری
- طنز ومزاح
- مختصر ادبی خبریں
- نامور ادبی شخصیات کے دلچسپ انٹرویوز

ماہنامہ ارژنگ کے سالانہ ممبر بن کر ادب کے فروغ میں ہمارا ساتھ دیں

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ مبلغ ایک 1000 روپے بیرون ملک 5000 روپے

ماہنامہ ارژنگ میں اشتہارات کی بکنگ کے نرخ

تفصیل	برائے ایک شمارہ	برائے تین شمارے	برائے چھ شمارے
مکمل صفحہ رنگین	5000 روپے	15000 روپے	30000 روپے
آدھا صفحہ رنگین	3000 روپے	9000 روپے	18000 روپے
مکمل صفحہ بلیک اینڈ وائٹ	3000 روپے	9000 روپے	18000 روپے
آدھا صفحہ بلیک اینڈ وائٹ	2000 روپے	6000 روپے	12000 روپے

ماہنامہ ارژنگ کی سالانہ ممبر شپ اور اشتہار کے لیے ابھی رابطہ کریں

0300-4489310-0331-4489310 nastalique786@gmail.com

دفتر: F/3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور، 54000 پاکستان

شاعر، کالم نویس، مترجم اور ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر اعلیٰ

عامر بن علی

کی کتب کے نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں

- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- ''محبت چھو گئی دل کو'' (شعری مجموعہ)
- گفتگو (انٹرویوز)
- آج کا جاپان (کالم)
- محبت کے دو رنگ (تراجم)

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

ناشر: حسن عباسی

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

اس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کی کتب

شعری مجموعے

- جگنو میری سوچوں کے
- ہم نے بھی محبت کی ہے
- ایک محبت کافی ہے
- اک شام تمہارے جیسی ہو
- سائیں (حمد و نعت)

سفرنامے

- محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (بھارت)
- ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (یو-اے-ای، دوحہ)
- تتلیاں ستاتی ہیں (یورپ)

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

ناشر: حسن عباسی

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 18 • مئی 2016ء • شمارہ نمبر 5

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
قمر ریاض (منظم) ⊙ حافظ مظفر محسن ⊙ سعدیہ سیٹھی

{مجلس مشاورت}

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ⊙ ظفر خان (امریکہ) ⊙ ارشد نذیر ساحل (چین)
محمد ادریس لاہوری (ناروے) ⊙ ناز اوکاڑوی ⊙ لبنیٰ صفدر

مدیر منتظم ⊙ زاہد محمود شمس قانونی مشیر ⊙ افتخار شوکت چوہدری 0321-6012211

کمپوزنگ ⊙ زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 ٹائٹل و گرافکس ⊙ نعمان حسن :0333-4918383

آسٹنٹ ایڈیٹر گرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الحمید سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 ناز اوکاڑوی: 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

بذریعہ ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0331-4489310 - 0300-4489310

فہرست

حمد ' ۲

نعت ' ۳

مضامین:

○ علی رضا اور ثنائے سرور ﷺ / پروفیسر محمد اکرم ناصر ' ۴

○ عباس تابش جدید اردو غزل کا معتبر نام / ثاقب تبسم ثاقب ' ۵

○ شیریں لغاری / خورشید بیگ میلسوی ' ۷

○ عامر بن علی فن اور شخصیت کے آئینے میں / راجا نیئر ' ۹

○ ستاروں سے بھرے باغات کا شاعر / احمد خیال ' ۱۳

○ جنید آذر کا بیت خانۂ سخن / ناز بٹ ' ۱۵

○ خوبصورت جذبوں کا شاعر...... رائے عابد علی / محمد حنیف رائے ' ۱۸

○ سائیں...... ندرت تخیل کا وجد آفریں تخیل / تفاخر محمود گوندل ' ۱۹

کالم: خلیل جبران سے احمد عدنان طارق تک / حافظ مظفر محسن ' ۲۱

افسانے: ○ کالا پربت / نیلم احمد بشیر ' ۲۲

○ جنازے کا اعلان بعد میں ہوگا / ناصر معروف ' ۲۸

○ چبھن / تسنیم کوثر ' ۳۱

○ سلور جوبلی / نادیہ احمد بشیر ' ۳۳

○ باپ کی چتا / سعدیہ بتول ' ۳۵

شعری گوشے: اقتدار ساجد، انمول گوہر، حنا عنبرین، اسد عباس اسد

جاوید عباس جاوید ' ۳۶ تا ۴۰

شاعری (غزل، نظم) ' ۴۱ تا ۴۵

آپ بیتی: شام و سحر کے درمیاں (چوتھی قسط) / رئیس عباس زیدی ' ۴۶

شاعری (غزل) ' ۴۸ تا ۵۰

○ بقیہ انٹرویو / منصور آفاق ' خالد شریف ' ۵۰-۵۱

مختصر ادبی خبریں ' ۵۳

تبصرۂ کتب ' ۵۶

نامہ ہائے احباب ' ۵۹

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد

اب ایک شہر مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
میں گھر سے نکلا تھا تنہا ترے سہارے پر

ترے کرم سے اُڑے ہیں ترے سہارے پر
جہاں میں پھیل گئے چار سو ہمارے پر
میں جب بھی ڈوبنے لگتا ہوں قعرِ دنیا میں
اُچھال دیتا ہے کوئی مجھے کنارے پر
کبھی ہمیں بھی اُٹھا روشنی کی لہروں سے
ہمارا نام بھی لکھ دے کسی ستارے پر
تو ماورائے زمان و مکان و نقش و نظر
میں چشمِ خاک پڑی زندگی کے آرے پر
اب ایک شہر مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
میں گھر سے نکلا تھا تنہا ترے سہارے پر
عطا میں رومی و سعدی کا ریزہ کار ہوا
سو آنکھ ٹھہری ہوئی ہے کسی نظارے پر

کیپٹن (ر) عطا محمد خان/لاہور

مغفرت کی سبیل کرتے ہیں
حمدِ ربِ جلیل کرتے ہیں
گڑگڑاتے ہیں آخرِ شب میں
اور سجدے طویل کرتے ہیں
تیری حکمت کے معترف ہو کر
ذکرِ اصحابِ فیل کرتے ہیں
تجھ کو اچھا گمان بھاتا ہے
خواہش سلسبیل کرتے ہیں
تو ہی سنتا ہے استغاثہ بھی
اور تجھی کو وکیل کرتے ہیں
صحنِ کعبہ میں شکر کی خاطر
دیدۂ شوق جھیل کرتے ہیں

نیک اعمال معجزے کی طرح
شخصیت کو جمیل کرتے ہیں

نورین طلعت عروبہ/اسلام آباد

عدل کرتا ہے کہ احسان مجھے دیکھنا ہے
تو ہے کس طرح کا سلطان مجھے دیکھنا ہے
بے ستوں جس نے کھڑے کر دیے ہیں یہ افلاک
چہرۂ صاحبِ میزان مجھے دیکھنا ہے
خلق بحروں کے شکم کو کیا لولو بکف
وہ جو ہے خالقِ مرجان مجھے دیکھنا ہے
خالقِ ارض و سما جس کو خدا کہتے ہیں
کاتبِ سورۂ رحمان مجھے دیکھنا ہے
تو نے پیدا کیا یہ سارا جہاں جس کے لیے
ایک پل کو وہی انسان مجھے دیکھنا ہے
جس نے اک کن سے کیا پیدا بھری دُنیا کو
وہ رحیم اور وہ رحمٰن مجھے دیکھنا ہے
اس لیے منتظر روز جزا ہوں عاصمؔ
زیبا کیوں ہے اُسے ہر شان مجھے دیکھنا ہے

ڈاکٹر غنی عاصم/ڈیرہ غازی خان

میری بگڑی ہے جو تقدیر بنا دے مولا
اور قسمت کو بھی تحریر بنا دے مولا
جو نہ مٹ پائے کبھی میری نظر کے گھر سے
اپنے کعبے کی وہ تصویر بنا دے مولا
سنگریزے بھی ترے شہر کے ہیں محو سرا
ان کے جیسی میری تقدیر بنا دے مولا
نکلہ پڑھتے ہی ترے گھر پہ ٹھہر جائے حیات
میرے قدموں کو ہی زنجیر بنا دے مولا
زندگی میری گزر جائے تری بستی میں
یہ ہیں گر خواب تو تعبیر بنا دے مولا
تیرے محبوبؐ پہ قربان کیے دیتا ہوں
میری اولاد کو شبیر بنا دے مولا

عبدالمجید چٹھہ/لاہور

نجانے کیا ہے ملال صاحب
ازل سے آنکھیں ہیں لال صاحب
یہ آنسو یونہی نہیں نکلتے
بہت ہے اندر اُبال صاحب
ہمارا ہونا نہ ہونے جیسا
ہمارا کیا انتقال صاحب
یہاں ہماری کوئی نہیں ہے
تمہاری کیا ہو مثال صاحب
کوئی تو ہے انتشار مجھ میں
کہ سرخ رہتے ہیں گال صاحب
لہو لہو میں بدن کا سونا
بہت بناتے ہو مال صاحب
تمہارے آنگن میں گم ہوئی ہے
ہمارے بچوں کی بال صاحب
تمہارا ابرِ کرم جو برسے
جنوب بھی ہے شمال صاحب
یہ تالیاں ہیں کرم تمہارا
وگرنہ سُر ہے نہ تال صاحب

حسن عباسی/لاہور

ہو دل کے شبستاں میں اُجالا، شہ والاؐ
ہو نعت تریؐ میرا حوالہ، شہ والا
ہے باعثِ تسکین ترا اسم گرامی
دیتا ہے مریضوں کو سنبھالا، شہ والاؐ
اے کاش میں کہلاؤں مدینے کا مہاجر
مل جائے مجھے دیس نکالا، شہ والاؐ
ماحول کی پُرہول فضاؤں میں گھرا ہوں
مر جاؤں نہ گھٹ کر شہ والاؐ، شہ والاؐ
روضے کی زیارت کو ترستی ہیں نگاہیں
آنکھوں میں اتر آئے نہ جالا، شہ والاؐ
ہو جائے زمانے کو تریؐ ذات کا ادراک
کھل جائے اگر ذہن کا تالا، شہ والاؐ
جاں دے کے تریؐ آلؑ نے یہ کر دیا ثابت
ہے سب سے گھرانہ ترا اعلیٰ شہ والاؐ
اب آپؐ کی سیرت ہی بچا سکتی ہے مجھ کو
دنیا سے پڑا ہے مرا پالا، شہ والاؐ
خورشید کو بھی اپنی غلامی کا شرف دے
وہ بھی ہے ترا چاہنے والا شہ والاؐ

خورشید بیگ میلسوی/ملسی

فقیر شہر محمدؐ میں نام ہو جائے
غم حیات کا قصہ تمام ہو جائے
وہ جانتے ہیں مرے دل کی بے قراری کو
نجانے کب یہ ہوا خوش خرام ہو جائے
بہشت چومتی پھرتی ہے نقش پائے رسولؐ
خدایا میرا بھی کچھ انتظام ہو جائے

زمانہ آج بھی امن و سکوں کا مسکن ہو
یہ شرط ہے کہ نبیؐ کا غلام ہو جائے
پھر اس کے عیب بھی اعزاز ہیں ہنر کے لیے
درِ رسولؐ پہ جس کا قیام ہو جائے
بس ایک بار میں چوموں سنہری جالی کو
نہیں ہے رنج جو دھڑکن کی شام ہو جائے
سلیم آب و ہوا گر ملے مدینے کی
گناہ گار پہ دوزخ حرام ہو جائے

عمران سلیم/لاہور

جس پہ ان کے کرم کی عطا ہو گئی
دور اس شخص سے ہر بلا ہو گئی
جب ہوا تھا فلک سے نبیؐ کا گزر
ہر طرف آسماں پر ضیا ہو گئی
جس پہ ان کی نگاہِ کرم پڑ گئی
ہر مرض سے یقیناً شفا ہو گئی
بزمِ عالم میں جب آگئے مصطفیٰ
ہر طرف مرحبا مرحبا ہو گئی
اترا جس دم حرا سے مہ آمنہ
جگہ نور ساری فضا ہو گئی
مجھ کو حاصل ہوا جب شعور سخن
دم بہ دم مصطفیٰ کی ثنا ہو گئی
میں بھی پہنچا درِ مصطفیٰ پہ قمر
آپؐ کے فیض کی انتہا ہو گئی

عبدالسلام قمر/بہاولپور

جو دل کہنے لگا یا مصطفیٰ ہے
تو دھڑکن نے کہا ہاں باخدا ہے
حرا کی تیرگی سپنوں میں دیکھی
یہیں سے روشنی کی ابتدا ہے
انھیں پہچان کر بھی بے خبر ہیں
یہی تو زندگی کا المیہ ہے
عجب عنوان ہے یادِ نبیؐ کا
کہ رونے کا بھی اک اپنا مزہ ہے
سفیرِ لا الہ نکلے ہیں عابد
بدن سے آپ کے جو خوں بہا ہے

رائے عابد علی/شیخوپورہ

شمع توحید کی سرکار جلانے آئے
یعنی ظلمات کا ہر نقش مٹانے آئے
میں نے ہونا تھا محمدؐ کا سو میں ہو بھی چکا
ایسے بے کار میں دنیا مجھے پانے آئے
جب بھی دھتکار کے دنیا مجھے تنہا کر دے
آپ کی یاد مجھے دل سے لگانے آئے
نعت کہنا تھی "کہا" صلی علی سیدنا
لفظ یک دم لیے نعتوں کے خزانے آئے
کاش سو جاؤں انھیں یاد میں کرتے ہوئے حسن
اور طیبہ کی ہوا مجھ کو جگانے آئے

زاہد محمود حسن/ملتان

علی رضا اور ثنائے سرور ﷺ

پروفیسر محمد اکرم ناصر/ساہی وال

علی رضا ہم تمہاری اس خوبی کے تو معترف تھے اور ہیں کہ تم لحن داؤدی کے مالک ہو اور نعت پڑھتے ہو تو مزہ آ جاتا ہے لیکن سچ کہوں "ثنائے سرورؐ" پڑھنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ جس طرح ہر غزل گو نے دو چار نعتیں کہہ رکھی ہوتی ہیں کہ نعتیہ مشاعروں میں پڑھی جا سکیں۔ تم نے بھی کہہ رکھی ہیں مگر نعتیہ مجموعہ اور وہ بھی ایسا بھرپور...... علی رضا تم نے ہمیں چونکایا ہی نہیں بلکہ کمال ہی کر دیا۔ تم واقعی مبارک باد کے مستحق ہو۔

ہاں نعت کی طرف تمہارا رجحان تو اُس وقت بھی سامنے آیا تھا جب تم نے ایک نعتیہ انتخاب "درود ان پر سلام اُن پر" مرتب کیا تھا۔ مگر ثنائے سرورؐ ایسا خوبصورت مجموعہ...... زباں ایسی صاف اور سادہ کہ کہیں کسی اُلجھن کا احساس نہیں لفظوں کی بازی گری نہیں۔ خیالات ایسے لطیف و پاکیزہ کہ ہر عاشق رسولؐ واہ واہ کر اُٹھے۔ میں ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ عشق ایک مقدس، مطہر اور پاک جذبہ ہے۔ محبوب جب نبی پاکؐ جیسی ہستی ہوں تو ہر پہلو لطف دے جاتا ہے۔ علی رضا تم نے یوں تو عشق کی تمام کیفیات کو اس مقدس رنگ میں رنگ دیا ہے۔ مگر محبوب اور دیارِ محبوب سے ہجر و فراق کی کیفیت ساری کتاب کو گھیرے ہوئے ہے۔

فراقِ طیبہ میں حالت ہے دیدنی میری
کہ دل سنبھلتا نہیں ہے مرا سنبھالے سے

....

حضور دوریٔ طیبہ میں جینا دو بھر ہے
علاج کچھ تو ہو فرقت کے جلاؤں کا

....

تڑپتا ہوں میں طیبہ کی طلب میں
وہیں آنکھوں کو بینائی ملے گی

علی رضا تم خوش قسمت ہو، تمہیں درِ رسولؐ پر جانے کا اعزاز ملا۔ تم نے اپنی آنکھوں سے اس مقدس سرزمین کو دیکھا جس کے لوگ خواب دیکھتے ہیں۔ یہ خوش بختی ہے سعادت ہے۔

سمجھ میں آئی حضوری کی ساعتوں میں یہ بات
درِ رسولؐ پہ تو انتہا کی خوشبو ہے

اُن کی چوکھٹ پہ پڑا سوچتا ہوں
کس بلندی پہ ستارا ہے مرا

اور اب تمہیں اس فریاد کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ سفینہ ساحل پہ اور مدینہ آنکھوں کے سامنے آ چکا ہے۔

ساحل پہ مقدر کا سفینہ نہیں دیکھا
سرکارا ابھی میں نے مدینہ نہیں دیکھا

مگر علی رضا مدینہ دیکھ کر تو پیاس اور بڑھ گئی ہے۔ جی چاہتا ہے بار بار وہاں جایا جائے اور ہر بار پیاس بڑھا کر لوٹا جائے کہ

وصال و ہجر جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

....

دل تڑپتا ہے کہ پھر روضۂ اقدس دیکھوں
اور چوموں در و دیوار مدینے والے
قافلے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں حسرت سے
میں ہی رہ جاتا ہوں ہر بار مدینے والے

....

وہ لمحہ ذہن کے پردے پہ نقش ہے اب تک
جب اُن کے در سے ہوا میں بڑے ادب سے جدا

....

مدینے والے سے تعلق واقعی باعثِ فخر، باعثِ ناز ہے۔ علی رضا تمہارا اعتراف عاشقانِ رسول کو پسند آئے گا۔

ناز کرتا ہوں اپنی قسمت پر
مجھ کو کہتے ہیں سب گدائے رسولؐ

....

اُن کی نسبت سے مجھے سارا جہاں جانتا ہے
ورنہ میں کیا ہوں مجھے کوئی کہاں جانتا ہے

علی رضا مجھے تمہارے نعت میں نکالے ہوئے منفرد اور جدید انداز کے اشعار بھی بہت اچھے لگے۔

سبق ملا یہ رضا اسوۂ نبیؐ سے مجھے
نہیں پکارتا دشمن کو بھی میں تو کر کے

....

اُتنے دن میں تو ہواؤں میں کہیں اُڑتا رہا
جتنے دن آپ نے رکھا مجھے مہمان حضور

اور یہ بات کرنے کا انداز، راز و نیاز کا رنگ بھی لطف دے گیا۔

دامنِ دل میں گناہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
مجھ گنہگار کا محشر میں رہے دھیان حضور

علی رضا ثنائے سرور ﷺ پر تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ، صنائع بدائع قوافی وغیرہ کے حوالے سے بھی مضمون لکھا جا سکتا تھا مگر میں نے پسند نہیں کیا کہ ایسی صاف و سادہ زبان کی حامل کتاب کو ایسے تنقیدی مضمون سے بوجھل کر دیا جائے، سو میں نے ایسا نہیں کیا۔ مگر بات کرنے سے پہلے آپ کو ایک مبارک اور بھی دینا ہے۔ امام احمد رضا خان بریلوی نے کہا تھا نعت کہنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ تم نے اس دھار کا بھی خوب خیال رکھا۔ نعت کا حق ادا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر ایک حد قائم رکھی۔ خالق و مخلوق کی حد۔ اس کا اجر تو تمہیں اللہ ہی دے گا۔ ہم صرف دعا دے سکتے ہیں خدا تمہیں شاد و آباد رکھے اور نعت کے میدان میں مزید کامیابیاں نصیب فرمائے۔ آمین

انبیا یوں تو زمانے میں کئی آئے مگر
سرورِ کونین جیسا دوسرا کوئی نہیں

چند اشعار نذر کرتا ہوں:

مدحت کے پھول جتنے کھلے ہیں علی رضا
تمغے حضورِ حق سے ملے ہیں علی رضا
مدح و ثنائے سرورِ کونین کے طفیل
کیا کیا عروج تم کو ملے ہیں علی رضا
ہیں رنگ مختلف تو ہے خوشبو الگ الگ
جتنے بھی پھول اس میں کھلے ہیں علی رضا
کہتے ہیں لوگ تجھ کو گدائے درِ رسولؐ
سب مدحِ مصطفیٰؐ کے صلے ہیں علی رضا
سارے ہی معترف ہیں ترے حسنِ ذوق کے
جتنے بھی لوگ مجھ سے ملے ہیں علی رضا
مانگو گے جو ملے گا یہ باغِ بہشت ہے
جو چاک ان سلے تھے سلے ہیں علی رضا

(یہ مضمون ساہی وال میں علی رضا کے نعتیہ مجموعے "ثنائے سرور ﷺ" کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا۔)

عباس تابش...... جدید اُردو غزل کا معتبر نام

ثاقب تبسم ثاقب

اردو غزل کی تابناکی اور بے باکی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔اس صنفِ شاعری نے ہر دور میں خود کو منوایا ہے۔اس کی مقبولیت اور فوقیت کے لیے ہر دور میں مختلف شعرا نے اپنی خدمات پیش کیں۔کوئی بھی عہد ہو، کوئی بھی دبستان ہو، اردو غزل نے اپنی روشنی سے کئی چہرے روشن اور کئی چہرے روشن تر کیے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ غزل کو اپنی آبیاری اور نمو کے لیے ایسے ایسے سہارے ملے ہیں کہ جن کے دم سے اردو غزل، اصنافِ شاعری میں ایک معتبر صنف قرار پائی ہے۔ان میں ولی، میر، غالب، مومن، حسرت، اقبال، ناصر اور منیر نیازی سمیت درجنوں ایسے نام ہیں جن سے غزل کی آبرو ہے۔ان بے مثال لوگوں نے اپنے اپنے عہد میں اردو غزل کی روایت کو مضبوط تر اور معتبر بنایا۔

۸۰ء کی دہائی میں بہت اہم نام عباس تابش کا ہے۔اردو شاعری میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ جب کسی شاعر کو اس کی زندگی میں ہی بے پناہ پذیرائی اور محبت ملتی ہے۔ایسا نصیب بھی نصیب والوں کو نصیب ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی خود اپنا حوالہ بن جائے۔عباس تابش ایسے ہی خوش نصیب شاعر ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں ہی عروج، شہرت، عزت اور بے پناہ محبت کے سارے رنگ دیکھے ہیں اور وہ ان رنگوں کے سمندر میں پوری طرح غوطہ زن بھی ہیں۔

آدمی اب بھاگ کر جائے کہاں؟
شہر کے چاروں طرف بھی شہر ہے

عباس تابش ۱۵ جون ۱۹۶۱ء کو میلسی میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام غلام عباس ہے اور ان کا تعلق راجپوت بھٹی گھرانے سے ہے۔عباس تابش کے آباؤ اجداد میں کوئی بھی شاعر یا ادیب نہ تھا تاہم ان کے گھر میں علمی اور تاریخی کتب بینی کا رواج ان کے والد اور بڑے بھائی کی وجہ سے پایا جاتا تھا۔انھی کتابوں نے ان کے اندر کا شاعر جگایا۔عباس تابش نے ۱۹۷۵ء میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔اس کے بعد ۱۹۸۱ء میں لاہور آئے تو یہ سلسلہ تا حال، تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔۱۹۸۶ء میں "تمہید" کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔اس کے بعد "آسمان"، "مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا"، "پروں میں شام ڈھلتی ہے"، "رقصِ درویش"، "شجر تسبیح کرتے ہیں" اور کلیات "عشق آباد" شعری اور ادبی حلقوں سے داد و تحسین وصول کر رہے ہیں۔عباس تابش کی شاعری میں غزل کو ہی خاص مقام حاصل ہے۔اس ضمن میں افتخار عارف کا یہ کہنا ہے کہ:

"عباس تابش اردو غزل کی روایت کو ثروت مند بنانے والی نسل کے میرے نزدیک سب سے نمایاں شاعر ہیں۔ایک مکمل شاعر جو غزل کی کلاسیکی روایت کے دائروں میں رہتے ہوئے مضمونِ تازہ کی نئی راہیں نکالتا ہے اور غزل بہ غزل اور کتاب بہ کتاب بلندیوں کی طرف گامزن ہے۔عباس تابش اپنی نسل کے مقبول ترین شاعروں میں ہیں۔"(۱)

عباس تابش نے غزل میں جہاں اسلوب کو ایک نیا انداز دیا ہے وہاں موضوعات کی کشید میں بھی خود کو منوایا ہے۔ان کے سامنے موضوعات ہاتھ باندھے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے روایت سے ناتا جوڑ کر عصرِ رواں اور مستقبل کی غزل کے لیے راستے ہموار کر دیے ہیں۔

نئے سرے سے تعلق نہیں بنائیں گے ہم
جہاں سے ٹوٹ گیا تھا وہیں سے جوڑیں گے
ہمارے پیچھے وہاں کس شمار میں ہوں گے
کہ جس قطار میں مجنوں کا نام آخری ہے

انھوں نے خود کو لفظی بازی گری میں ضائع نہیں کیا بلکہ روایت سے پیوند کاری کرتے ہوئے ذائقہ دار پھل اور نئے نئے پھول دریافت کیے اور موضوعات میں نئے نئے رجحانات کو فروغ دیا ہے۔اس بات کی وضاحت ڈاکٹر اجمل نیازی اس طرح کرتے ہیں:

"عباس تابش نے شاعری کو رقصِ درویش بنا دیا ہے تو پھر یہ کچھ اور ہی شاعری ہے اور یہ شاعری سے آگے کی چیز ہے۔لفظ و خیال کی حکمرانی اور ہجر و وصال کی درویشی کے امتزاج سے شاعری کا جو مزاج بنتا ہے اسے عباس تابش نے ایک ان دیکھی معراج پر پہنچا دیا ہے۔"(۲)

غزل جذب و خیال، متنوع موضوعات کا حیرت کدہ اور جہانِ معنی کا آئینہ خانہ ہے۔اس میں زندگی کی سی وسعت ہے۔جس طرح زندگی اپنے اندر تمام موسم، رنگ، واقعات، جذبات، تحریکات، چہرے، نظریے اور رویے سمو لینے پر قادر ہے اسی طرح غزل بھی ان سب عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔جس طرح زندگی کا ارتقائی سفر جاری رہتا ہے اسی طرح غزل بھی اپنا ارتقائی سفر جاری رکھتی ہے اور زندگی کے بدلتے مناظر اور مظاہر صنفِ غزل کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ایسے تمام موضوعات، رنگ، موسم، مناظر اور مظاہر عباس تابش کی شاعری کی زینت ہیں۔

جب بن گیا تو اس کی دنیا مثال دے گی
تعمیر ہو رہا ہے جلنے سے گھر ہمارا
کب تمہیں عشق پہ مجبور کیا ہے ہم نے
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں، چلے جاتے ہیں

تصوف، عشق و محبت، ہجر و وصال، حسن و جمال، تنہائی و نارسائی، آشوبِ ذات، فطرت نگاری، تمثیل نگاری، سیاسی و سماجی حالات، تخیل اور خواب، حب الوطنی، موت و حیات کا فلسفہ، پرندے، ماں، انسانی عظمت، ہجرت اور اخلاقی قدریں ان کی

غزل کا خاصہ ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے اکثر موضوعات عام لگیں لیکن عباس تابش کی شاعری میں یہ موضوعات تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند محسوس ہوتے ہیں۔انھوں نے بالخصوص تصوف اور عشق کو "رلا ملا" دیا ہے اور اس امتزاج سے شاعری کو تابندگی بخشی ہے۔اس حوالہ سے ڈاکٹر ضیاء الحسن رقم طراز ہیں:

"عباس تابش کی شاعری میں شاعری، درویشی اور عشق ایک ہی کام ہے، یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں انھی موضوعات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اُس نے ان بظاہر مختلف نظر آنے والے کاموں میں ایک تعلق تلاش کیا ہے۔" (۳)

اک چٹائی تھی مری، ایک پیالہ تھا مرا
عام ہو کر بھی یہی خاص حوالہ تھا مرا
میں کہ نقصان کے مانند ملا تھا خود کو
عشق کرنا ہی مری جان ازالہ تھا مرا

ان کی شاعری میں موضوعات کے رجحانات بدلتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شاعری کے سفر میں مشاہدے اور تجربے کو ہم سفر بنائے رکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں ایک بھرپور تحریک ہے جو ہر قسم کا جمود توڑنے کے کام آتی ہے۔ عباس تابش کی شاعری میں موضوعاتی تنوع اور خیال کی رنگا رنگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

عشق نے ظلم کمانے کی اجازت ہی نہ دی
ورنہ یہ شہرِ ستم ایک نوالہ تھا مرا

انھوں نے نرگسیت سے حیات شناسی تک کا سفر کامیابی سے طے کیا ہے جس میں مظہریات اور جمالیات کو خاص مقام حاصل ہے۔انھوں نے علامت و استعارہ کا اک نیا جہان آباد کیا ہے جو ان کی خاص پہچان ہے۔ گھر، پیڑ اور پرندے ان کی محبوب و مرغوب علامتیں ہیں اور یہی علامتیں ان کی غزل کی پیامبر بھی ہیں۔

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
میرے اعصاب معطل نہیں ہونے دیں گے
یہ پرندے مجھے پاگل نہیں ہونے دیں گے
یارا اک بار پرندوں کو حکومت دے دو
یہ کسی شہر کو مقتل نہیں ہونے دیں گے
اس لیے میں نے درختوں سے اجازت مانگی
اچھا لگتا ہے مجھے اپنوں سے مل کر رونا
پھر اس کے بعد پھلوں میں مٹھاس آئی نہیں
شجر نے کام لیا تھا غلط بیانی سے

انھوں نے پیغام پہنچانے کا جو ڈھنگ اور قرینہ سیکھا ہے اس کو سلیقے کے ساتھ نبھایا بھی ہے۔ ایک ہی خیال کو مختلف پہلوؤں میں بیان کرنے کا فن ہی دراصل ان کی انفرادیت ہے اور یہ انفرادیت ہی ان کی طاقت اور محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے موضوعات قلب اور روح کی گہرائیوں میں اتر کر اذہان کی تطہیر و تنویر کرتے ہیں جن میں اثر آفرینی کا اعجاز پوری طاقت سے موجود ہے۔

کوئی افواہ بھی آنگن میں اتر سکتی ہے
یہ ضروری نہیں کھڑکی سے ہوا ہی آئے

ان کا یہ سلسلہ تا حال کامیابی سے جاری ہے۔ان کے حوالہ سے جاوید اختر پاشا کا ایک جملہ ہی کافی ہے:

"عباس تابش ایک ازلی شاعر ہے جس میں ابدیت بھی پوشیدہ ہے۔" (۴)

اکثر و بیشتر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ ادبا و شعراء کو ان کا صحیح مقام ان کے قیدِ حیات سے آزاد ہونے کے بعد ملتا ہے لیکن ایک سچے تخلیق کار کا بروقت اعترافِ کمال بھی ایک نیکی ہے اور اس کو زندگی میں ہی پذیرائی ملنا چاہیے۔ عباس تابش بھی عصرِ حاضر کے جدید اور اہم ترین شاعر ہیں۔ وہ ایسے خوش نصیب شاعر ہیں کہ انھیں ان کی زندگی میں ہی عروج و پذیرائی حاصل ہے۔ کسی بھی محفل میں ان کا وجود طمانیت کا باعث ہوتا ہے۔ عباس تابش نے جس مہارت اور ضرورت کے تحت اپنے موضوعات سے نبھا کیا ہے وہ انھی کا خاصہ ہے۔ اردو جدید شاعری کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو عباس تابش کی غزل کو ایک مستند حوالہ کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ اس وقت بہت سے شعراء موجود ہیں جو اپنا مخصوص اسلوب اور انداز کلام رکھتے ہیں لیکن عباس تابش کو ان کی زندگی میں باقی ہم عصروں کے مقابلہ میں زیادہ پذیرائی ملی ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ کسی خاص انفرادیت کے حامل ہوں گے

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے
وہ اکثر خواب میں آ کر مری حالت پہ روتی ہے
کہ زیرِ خاک بھی ماں کی پریشانی نہیں جاتی
کلاہ و تخت سے شہزادگی بالکل نہیں مشروط
کہ جب تک ماں ہو زندہ، بوئے سلطانی نہیں جاتی

عباس تابش کی شاعری میں اردو غزل کے روایتی اور جدید موضوعات پوری طاقت، توانائی اور وقار کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات میں اک نئی جان اور ان کی اک منفرد شان ہے اور انھوں نے ہر عہد میں زندگی کے تغیرات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ عباس تابش کے شعری موضوعات ان کی زندگی کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ اردو غزل کا جمود توڑنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں اور اس عہد کو اپنے نام کرنے کے تمام شعری لوازمات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ بلاشبہ ان کا نام اردو غزل میں ایک معتبر حوالہ ہے اور اکیسویں صدی کی غزل ان پر فخر کرے گی۔ان کی شاعری ان کا حوالہ اور وہ شاعری کا حوالہ ہیں۔

کہیں چراغ کہیں چشمِ تر حوالہ ہے
ہر اک حوالہ مرا معتبر حوالہ ہے
کہیں میں کام کہیں صرف نام ہوں تابش
کہیں طویل کہیں مختصر حوالہ ہے

حوالہ جات: ۱۔ افتخار عارف، فلیپ، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
۲۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر، فلیپ، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
۳۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر، پیش لفظ، شجر تسبیح کرتے ہیں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء
۴۔ جاوید اختر پاشا، بہت مجبور ہوں تابش مگر اپنا خدا ہوں، مشمولہ بیاض، لاہور، ملتان روڈ، ۲۰۰۴ء

شیریں لغاری جنوبی پنجاب کے نسائی ادب کے آسمان کا مہتاب

خورشید بیگ میلسوی

استغراق، انہماک، سچائی اور دیانت کی متقاضی۔ایجاب وقبول کے رشتے جیسی بظاہر اختیاری بہ باطن رگ وپے میں سرایت کر جانے والی شاعری آئینہ ہے۔ ہر کیفیت کے عکاس میں کیفیات کی لفظی صورت گری میں کہاں تک اور کتنی کامیاب رہی اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہوئے نہایت اعتماد کے ساتھ کچھ منتخب کلام پیش کر رہی ہوں۔

سابق پرنسپل اور معروف شاعرہ شیریں عنبر لغاری نے اپنی تازہ ترین تخلیق ''کربِ احساس'' کے عرضِ حال میں یہ جملے لکھ کر لاہور، اسلام آباد اور کراچی سے دور بیٹھ کر ایک ایسا نغمہ ادب گنگنایا ہے جس کی ہر لے میں لکھنؤ، دلی اور مذکورہ تینوں ادبی مراکز کے مماثل آہنگ موجود ہیں۔اس کی وجہ طویل ریاضتِ علمی وادبی کہیں یا ان کی حساسیت کے اظہار کا رنگ بہرحال جنوبی پنجاب میں ان کی 16 تصانیف آسمانِ ادب پر کہکشاں کے ستاروں کی طرح جگمگ کر رہی ہیں شیریں لغاری عنبر تخلص کرتی ہیں اور اُردو اسلامیات میں بیک وقت عبور رکھتی ہیں۔اس سے پہلے ان کے تین شعری مجموعہ کلام اہل نقد وادب سے داد پا چکے ہیں جن میں آبنائے درد 2013 میں شائع ہونے والا مجموعہ کلام ہے۔ ''میری یادیں سنبھال رکھنا'' 2014 میں شائع ہوا۔''چپ کی جھیل'' 2015 میں شائع ہوا اور چوتھا شعری مجموعہ ''کربِ احساس'' زیر نظر مجموعہ غزل ونظم ہے جو 160 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے خوبصورت ٹائٹل میں آنکھ، آنسو اور سمندر میں صدف کے بننے کے عمل کو شعری تخلیق کا ایک محرک قرار دیا گیا ہے، جس میں آسمان کے بادلوں سے آنکھ کے رستے ایک قطرۂ نیساں صدف میں ڈھلتا ہے۔جبکہ ابتدا میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا مضمون بعنوان نسائی لب و لہجے کی عکاس شاعرہ شیریں عنبر لغاری، ڈاکٹر مختار ظفر کا مضمون کربِ احساس کے تخلیقی رنگ اور ڈاکٹر ارشد خانم کا مضمون شیریں لغاری کا ادبی سفر بھی شامل ہیں۔اُردو ادب میں کلاسیکی شاعری کے بعد جس دبستان کے ذکر سے بھی موسوم ہوا اس میں ان حالات کا ضرور ذکر ہوا ہے جن حالات سے وہاں کی دانشوری گزری میر وسودا کے زمانے میں داخلیت، غالب اور ذوق کے زمانے میں داخلیت اور مشاہدات کا رنگ، حالی اقبال اور اکبر کے دور میں بیداری ملت اور ناصحانہ اسلوب میں ادب کی کلاسیکی روایات کے حسن کا نزول فیض وفراز تک یہ سلسلہ بیداری اور کلاسیکی روایات سے جڑا واضح نظر آتا ہے۔ جبکہ اس عہد تک اردو ادب کو پہنچتے پہنچتے پڑوسی ملک بھارت کے علاوہ پاکستان میں کئی بڑے ناموں کا واسطہ پڑا جن میں نسائی ادب کا بھی بڑا حصہ ہے۔جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ناول افسانہ، مضمون، مقالہ میں شاعر داخلی اور خارجی احساسات و مشاہدات کو اپنے اسلوب کے مطابق ظاہر کرتا ہے اسی طرح شاعری میں اس کائنات کی ایک ستارے کی صورت میں تشکیل ہو جاتی ہے۔ جو بظاہر اپنی ہیئت میں دو مصرعوں پر مشتمل ہے لیکن اس میں خیالات کے کئی عمیق سمندر موجود ہو جاتے ہیں۔ شیریں لغاری کے ہاں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے وہ غزل ہو یا نظم ان کی کوشش ہوتی ہے روایت کو ترک کیے بغیر اپنے سے پہلی شاعرات ادا جعفری، پروین شاکر، کشور ناہید کے انداز اظہار کو سامنے رکھتے ہوئے ایک نئی راہ نکالیں۔یہ ایسے ہی ہے جیسے دکھ کا اظہار کبھی آہ میں، کبھی آنسو میں اور کبھی صبر میں ہوتا ہے۔کربِ احساس کی شاعری ان تینوں اظہاریوں کی امین ہے۔

کچھ اشعار دیکھئے:

مجھے غم سے محبت ہو گئی ہے
ترا غم میری محبت ہو گئی ہے

بیزار تھے جب لوگ میرے جینے سے شیریں
مرقد پہ مری کس لیے میلہ سا لگا ہے

یاروں سے شکایت نہ مسیحا سے گِلہ ہے
بیمار ہم ایسے تھے کہ آرام نہ آیا

اس میں لسانی تشکیلات، لفظیات کا قرینہ اور جدت کا حسن اپنی اپنی جگہ موجود ہے۔دراصل کربِ احساس میں ہمیں اگر مشاہداتی عنصر کی ایسی حیاتی شاعری ملتی ہے تو اس میں متقابلہ اضافیاتی محرومی اور اُداسی کے علاوہ ایسا پیغام بھی ملتا ہے جس میں نسائی وقار کو اپنے منوانے کے لیے ایک جدوجہد پر لانے کی روش محسوس ہوتی ہے۔ نئے الفاظ وتراکیب اس دوران خود بخود شیریں لغاری کی علمی شخصیت سے ہویدا ہوتے ہیں۔بعض شعر تو دل پر ایک منظر نامہ اُبھار دیتے ہیں۔کچھ مثالیں دیکھئے:

جنگل میں کھلا پھول کسی کام نہ آیا
گلشن کی بہاروں میں میرا نام نہ آیا

نگاہِ ناز نے جادو جگا دیا جاناں
فقیہ شہر کا شملہ جھکا دیا جاناں

جانے کیوں ہیں برہم سے
جان سے ہیں جو پیارے لوگ

ہم تو دیکھیں جلوہ ان کا
دیکھیں چاند اور تارے لوگ

شیریں لغاری کی نظموں میں پڑھنے والوں کے لیے لفظی پیکر تراشی کے علاوہ تخلیقی فعالیت اور حساس دلوں کے اشتراک کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ یہاں وہ ایک ایسے معاشرے کا حصہ ہیں جہاں موجود ہر فرد ان کا غمگسار، ان کے قریب بیٹھا ہوا ہے اس حوالے سے غزل اور نظم میں ان کے اسالیب مختلف نظر آتے ہیں۔ غزل میں ان کے ہاں ایک انفرادی بلندی ہے۔ جبکہ نظم میں ان کے ہاں اجتماعیت کا احساس ہے کچھ نظموں کی لائنیں دیکھیے:

فقط باتیں اندھیروں کی
عبث قصے اُجالوں کے
چراغ آرزو لے کر
نہ ہم نکلے نہ تم نکلے (چراغ آرزو)

محبت کانچ کی مورت
بالآخر ٹوٹ جاتی ہے
گھڑی بھر بیٹھ جاؤں ناں
کہ مجھ کو دور جانا ہے
ہنسی دیکھی ہے بس تو نے
میرے آنسو نہیں دیکھے
(محبت کا اقتباس)

ہم اپنے مضمون کو ڈاکٹر طاہر تونسوی کے اظہاریے پر تمام کرتے ہیں "میرے نزدیک شیریں عنبر لغاری لحہ موجود کی ایک ایسی عہد ساز شاعرہ ہیں کہ جنھوں نے اپنی تخلیقی فعالیت کو الفاظ کا خوبصورت اور حسین پیراہن عطا کرتے ہوئے غم و آلام کو اپنے دامن میں چھپاتے ہوئے اپنی شاعری کو ایک شیرینی عطا کی ہے جس کا ذائقہ دائمی بھی ہے اور انفرادی بھی۔"

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

عامر بن علی......فن اور شخصیت کے آئینے میں

راجا نیر/لاہور

اردو ادب میں نثر کی نسبت ہمیشہ شاعری کو اہمیت و اوّلیت حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نثری ادب کی بجائے شاعری کے حوالے سے اس قدر اہم نام سامنے آتے ہیں کہ انھیں یاد کرتے کرتے تحقیق کرنے والے کی سانسیں پھول جائیں مگر اس حوالے سے ترتیب دی جانے والی فہرست ادھوری ہی رہ جائے۔ ہمارے ہاں، اُردو، پنجابی و دیگر مقامی زبانوں میں شاعری کرنے والوں کو اکثر اُس دہائی سے منسوب کر دیا جاتا ہے جس میں اُن کا نام ادبی جرائد و رسائل، ریڈیو، ٹی وی کے ذریعے سے سامنے آتا ہے۔

جس طرح ہمارے ہاں اَسّی کی دہائی کی ایک آمرانہ دور کے تناظر میں کی جانے والی شاعری یا اُس کے پس منظر سے اُٹھنے والی غزل اور نظم کے نام جب سامنے آتے ہیں تو لوگ بتاتے ہیں کہ خالصتاً اسی کی دہائی کے وسط تک نوجوان شعراء کی ایک مضبوط اور تازہ تر لب و لہجے سے آراستہ کہکشاں آسمانِ ادب پر طلوع ہوئی جن میں اوّل اوّل غلام محمد قاصر، خادم رزمی، سرور ارمان، اجمل سراج، لطیف ساحل، اسلم کولسری، قمر رضا شہزاد، عباس تابش، سعداللہ شاہ، اختر شمار، اطہر ناسک، فرحت عباس شاہ اور راجا نیر، شناور اسحاق، جواز جعفری، حسن جاوید، اکرم ناصر، مسعود اوکاڑوی، آفتاب حسین، مقصود وفا، انجم سلیمی اور عمران نقوی بھی سیاسی پس منظر سے اُبھر کر سامنے آئے۔

☆ (اقراء شوکت، عمران نقوی بطور شاعر کے تھیسس میں لکھتی ہیں)

اسی طرح 90ء کی دہائی میں سامنے آنے والے شاعروں میں سعود عثمانی، منظر اختر جعفری، وصی شاہ، عامر بن علی، ابرار ندیم، ثناء اللہ شاہ، واجد امیر، محمد کامران، ناصر بشیر، صغرا صدف، حسن عباسی، کنور امتیاز و دیگر کئی نام سامنے آتے ہیں۔ اُردو غزل اور نظم دونوں حوالوں سے خود کو متواتر لکھتے ہوئے منوانے والوں میں عامر بن علی کا نام اس لحاظ سے اہم ہے کہ اُس نے خود کو مسلسل شاعری کے ساتھ وابستہ رکھا۔ وہ اب تک اُردو ادب کو چار شعری مجموعے دے چکا ہے جن میں سے بیشتر کے پانچ، سات سے زائد ایڈیشن شائع ہوئے ''یاد نہ آئے کوئی''، ''سرگوشیاں''، ''چلو اقرار کرتے ہیں'' اور ''محبت چھوئی دل کو'' کے ساتھ ساتھ عامر بن علی کے کالموں کا ایک مجموعہ ''آج کا جاپان'' جو ایک حیثیت سے سفرنامہ بھی ہے۔ علاوہ ازیں عامر بن علی نے بین الاقوامی شہرت یافتہ (نوبل انعام یافتہ) دو شاعروں گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کا ہسپانوی زبان سے براہ راست اُردو میں منظوم ترجمہ کر کے ''محبت کے دو رنگ'' کے نام سے شائع کروایا اور اُردو کے کئی اہم ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویو ''گفتگو'' کے نام سے شائع کیے۔ عامر بن علی کی زیر ادارت قریباً بیس برس سے ''ارژنگ'' اردو جریدہ شائع ہو رہا ہے جسے عامر بن علی نے اُردو ادب سے اپنی محبت کے اظہار کے لیے آغاز کیا تھا اور آج تک جاری و ساری ہے۔

میں جب بھی عامر بن علی کے حوالے سے سوچتا ہوں تو اسے ایک ایسا کمٹڈ انسان پاتا ہوں کہ جو آنے والوں کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کا ظاہر و باطن صاف ستھرا، رکھ رکھاؤ اور تہذیب اس کی شخصیت سے جھلکتی ہے۔ وہ پرتپاک انداز سے ملنے والا، تعلقات اُستوار کرنے میں پہل کرنے والا اور تعلقات کو غیر مشروط طور پر نبھانے والا انسان ہے۔ میں نے اسے کبھی کسی کا دل دکھاتے یا سطحی انداز سے کسی کے ساتھ مکالمہ کرتے سنا نہ دیکھا۔ اس لیے میں اُسے ایک شائستہ، مہذب، پرتپاک، ملنسار، مخلص، ہمدرد اور وفا شعار دوست کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ عامر بن علی اپنے دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کچھ دوستوں کے درمیان شکر رنجی یا کوئی ناراضی کی فضا قائم ہو جائے تو عامر بن علی ان کو ملانے میں ہمیشہ پیش پیش دیکھا گیا ہے۔

اسی طرح عامر بن علی کی شاعری کی فضا میں بھی وہی محبت، خلوص اور ہمدردی کی جھلک واضح طور پر محسوس ہوتی دیکھی جا سکتی ہے۔ عامر بن علی کی شاعری انسان، ماحول اپنی تہذیب، وطن، قوم اور اس کے اطراف کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ نرم گفتار، دھیمی آنچ پر جذبوں اور احساسات کو آپس میں ہم آہنگ کر کے اپنے سامعین و قارئین تک اپنی تخلیقات پہنچاتا ہے۔ عامر بن علی کی شاعری میں اس کا عہد بھرپور انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔

ہم نے ٹوٹے ہوئے خوابوں کا صلہ کب مانگا
قصرِ شاہی سے مساوات کا حق مانگتے ہیں

....

نفرتیں تو بڑھ گئی ہیں دوستی ملتی نہیں
اس نگر میں اب سنا ہے عاشقی ملتی نہیں
اور بھی دنیا میں کتنے خوبصورت لوگ ہیں
ہاں مگر جو اس میں ہے جادوگری ملتی نہیں
زرد پتے گر رہے ہیں جو خزاں کے خوف سے
پیڑ سے جو کٹ گرے تو زندگی ملتی نہیں

....

شہروں شہروں دیس میں خوف کا پہرہ ہے
کہتی ہے سرکار کے دور سنہرا ہے
کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہو پایا ہے
گونگی ہے جنتا یا حاکم بہرہ ہے

....

دل کی بستی ایسی اُجڑی خاک اُڑے ہے یادوں کی
کب برکھا کی آمد ہوگی کب آنچل لہرائے گا

عامر بن علی اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث اکثر جاپان رہتا ہے اور وہاں سے اس کا کاروبار آگے سے آگے اسے دنیا کے کئی ملکوں میں کھینچے رکھتا ہے لیکن اس کی سوچوں، خیالوں اور شعروں میں اس کا اپنا وطن اور یہاں کے عوام ان کے حالات رہتے ہیں۔تبھی تو ایسے چونکا دینے والے شعر اس کے ہاں ظہور پاتے ہیں۔

بکھری ذات کے حصے لے کر جینا ہے
اب ماضی کے قصے لے کر جینا ہے
نئی نئی اس بستی کے بازاروں میں
وہی پرانے سکے لے کر جینا ہے

جی ہاں! وہ سنہری یادوں کے سکے اپنے ذہن کے ”گلے“ میں ڈالے، دیارِ غیر میں بھی یہاں کے تصورات، یہاں کے حالات، یہاں کے مسائل، عمر گزشتہ اور خوشگوار مستقبل کے سندر خواہشات کے سکے کھنکھناتا رہتا ہے اور سنہرے مستقبل کی زمین کو اچھی آرزوؤں کے بیج ڈال کر مہکانے کے عمل میں مصروف رہتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ انسان اپنی اصل دھرتی، اپنے اصل وطن کو پھلتا پھولتا اور اہل وطن شادمان دیکھنے کا نہ سوچے تو وہ انسانیت کے درجے پر فائز نہیں ہوسکتا۔ محبت، امن خوشحالی، ترقی کے خواب بنتا عامر بن علی اپنے ان تمام سپنوں کو حسین تعبیروں کی صورت اشعار میں ڈھالتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں ہمہ گیریت کے بھرپور اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

ہمیں یہ ڈر ہے کسی دن وہ جاں بھی لے لے گا
یہ زہرِ غم جو ہماری رگوں میں پلتا ہے

....

یہ شہرِ جاناں کو کیا ہوا ہے
وفا کا معنی بدل گیا ہے
میں کرچی کرچی بکھر چلا ہوں
یہ وقت جیسے پگھل رہا ہے

....

ایک لمحہ چین جی پاتا نہیں
بے گھری کا خوف کیوں جاتا نہیں
نفرتوں کا راج ہے اس شہر میں
پیار کا موسم یہاں آتا نہیں

یہ ہے وہ عامر بن علی کا اصلی چہرہ، اُس کے ہنر میں جلوہ گر ہوتی سچائیوں کا ترجمان کہ وہ ایک خاص طرزِ حیات میں زندہ رہنے، تمام تر بنیادی سہولتوں سے آراستہ، آسائشوں کے باوجود خوب محنت کرتا ہے، آرام طلب نہیں اور دوسروں کی زندگی کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تیسرے، چوتھے اور آخری درجے کی زندگی گزارنے والوں کے دکھ درد سے آشنا ہے اور ان کے لیے بہتر زندگی کا خواہشمند ہے۔ کتنے لوگ اور ہیں اُس کے طبقے سے جو بہتر طرزِ عمل سے اس قدر خوبصورت اندازِ فکر اور آرزو کے عکاس ہیں۔

میں تو جب جب ایسی فکر و دانش رکھنے والوں کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہوں تو وہ مجھے تنہا دکھائی دیتا ہے۔ جو ہمارے جیسے عام لوگوں، عام محکوم طبقے کے لیے سوچتا ہے، گرم جوشی کے ساتھ...... کمال والہانہ اندازِ فکر سے عامر بن علی اپنی سوچ اپنے شعور کی روشنی سے ادب پارے تخلیق کر کے اپنے نظریات کو قارئین ادب کے ذریعے پورے سماج کی سماعتوں میں اُتار رہا ہے۔ یہ کوئی عام بندہ نہیں محسوس کرسکتا، ہاں اہلِ دل، اہلِ درد، اہلِ ہنر اگر غور کریں تو انھیں قائل ہونا ہی پڑے گا کہ عامر بن علی ایک منفرد طرزِ احساس کا کمیٹڈ شاعر ہے۔ اس کی نظم ”وطن“ کے دو شعر اردو نظمیں پیش کر کے تھوڑی بات اُس کے ہسپانوی شاعروں کے ترجمے پر بھی کرنا چاہوں گا کہ وہ بھی ترجمہ ہونے کے باوجود کئی لحاظ سے تخلیقی پیرائے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔

زندہ باد ارضِ وطن کے بادشہ تیرے سبب
ہونٹ سب کے سل گئے گھاؤ نہ کوئی بھی سلا
یہ تو وہ منظر نہیں جس کا تھا ہم کو انتظار
زخم سارے کھل اُٹھے غنچہ نہیں کوئی کھلا

دیکھیے کس مہارت سے عامر نے ایک درد نا کی کو Soft امیجز کے ساتھ دھیمے دھیمے رنگوں میں سطحِ خیال پر Paint کیا ہے۔ دوسرے شعر کو آپ ایک قطعی مختلف انداز میں پینٹ کی گئی ایک شاہکار پینٹنگ

سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کی حقیقی زندگی کو شعری محسوسات کے ساتھ Paint کر کے ہمارے سامنے رکھ رہا ہے کہ دیکھئے یہ ہے سچی تصویر۔ ایک حقیقی منظر، جہاں زخم کھلے ہیں مگر کوئی پھول، کوئی غنچہ، کوئی آسائش بھرا نغمہ نہیں مہکا۔

وہ ارباب بست و کشاد کو ایک عجیب سے طنز بھری مسکراہٹ سے دیکھتا اور کہتا ہے:

لہو میں ڈوب کر بھی مطمئن ہوں
تمہیں مہندی رچانا آ گیا ہے

حکمرانوں کی روزمرہ کی نعرہ بازی، سیاسی قلابازیوں اور لوٹ کھسوٹ پر اس سے انوکھے اور کسی انداز میں طنز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ محبت اور احساسات کو بھی اپنے اشعار کا حصّہ بناتا ہے مگر جلد ہی اُن پر بھی کرب کا رنگ غالب آنے لگتا ہے۔ وہ چاہے تو انتہائی سہولت کے ساتھ، سوچوں کی رفتار بڑھا کر آگے نکل جائے۔ سکون، آسودگی اور اطمینان کسی چیز کی کمی نہیں اُس کی زندگی میں...... لیکن وہ بریک لگا کر، ٹھہر ٹھہر کر اپنے وطن اور اہلِ وطن میں ہونے والے روزمرہ کے درد و غم سے اٹے واقعات کو دیکھتا، اُن سے شدید متاثر ہوتا اور پھر اُسے کمالِ ہنرمندی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ تو بے ساختہ اُس کے اس طرزِ عمل پر دل سے اس کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ ایک نظم دیکھئے:

"دشتِ سخن"

شاعری میرے لیے
تاریخ میں رقم ہونے کی تمنا ہے
اور نہ خواہش ہے ایسی شہرت کی
جو میرے بعد بھی زندہ و تابندہ رہے
شاعری
غم سے بھری دنیا میں
ایک کوشش ہے نئی دنیا کی
ایک کوشش ہے نفرتوں کے خلاف
شعر ایک آرزو ہے جینے کی
ایک چاہت ہے زندگی کے لیے

اور ایک نظم محبت کے پس منظر میں کھلتے احساسات کے پھولوں جیسی مگر اس نظم کا تاثر اور ظاہری عکس کچھ اور ہی بھید بھاؤ کھولتا محسوس ہوتا ہے۔

"ہم دل کو یوں سمجھاتے ہیں"

دل ناصبور سن لے
یوں فراق میں کسی کے
ترا اس قدر تڑپنا
تجھے بے طلب نہ کردے

بین الاقوامی سطح کی شہرت رکھنے والے نوبل انعام یافتہ شعراء گیبریلا مسترال اور پابلو نرودا کے تراجم پر مبنی عامر بن علی کے مجموعہ "محبت کے دو رنگ" پر بھی کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم اس کی ساری شاعری اور باقی تمام کاموں پر بھی کسی وقت ضرور تحریر کرنا ہے لیکن سر دست ان نظموں کو ذائقہ چکھنے کے طور پر آپ کی نذر کرتا ہوں کیوں کہ عامر نے ایک دوسری زبان (ہسپانوی) سے براہ راست اُردو میں انھیں ترجمہ کیا ہے۔ تاہم اُن کے تاثر اور تاثیر کو قاری تک پہنچانے میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

"تین درخت"

تین گرے ہوئے درخت
ایک شاہراہ کے کنارے پڑے ہیں
لکڑہارا انھیں بھول چکا ہے
اور وہ باتیں کر رہے ہیں
محبت میں مصروف
تین اندھے آدمیوں کی طرح
ڈوبتا ہوا سورج اُگل رہا ہے
اپنا چمکیلا خون
ٹوٹی ہوئی شاخوں کے اوپر
اور ہوا اُن سے خوشبو چرانے کے لیے جارہی ہے
ایک مڑی ہوئی ٹہنی
اس کا ایک بڑا بازو، لرزتے ہوئے پتوں کے ساتھ
ایک دوسری ٹہنی کے زخموں کی طرف دیکھ رہا ہے
ایسے لگتا ہے جیسے دو آنکھیں ہوں
التجاؤں سے بھری ہوئی
لکڑہارا اُنھیں بھول چکا ہے
رات دبے پاؤں چلی آتی ہے، میں ان کے ساتھ
رہوں گی رات بھر
میں اپنے سینے میں بھرلوں گی ان درختوں کا رس
اور برادہ
وہ مجھے گرم جوش رکھے گا
اور نیا سورج طلوع ہونے والا دن ہمیں
دکھی سنگت میں پائے گا
خاموش
ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے

گیبریلا مسترال 1889ء میں پیدا ہوئی اور 1951ء تک اس دنیائے فانی میں زندہ رہی۔ اگر اُس نے 1950ء کے لگ بھگ بھی یہ نظم کہی ہو تو اس کے جدید طرزِ اظہار اور کائنات سے شعوری دردمندی کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ کے انداز کو سمجھنے میں کس حد تک مدد دیتی ہے۔ یہ نظم عامر بن علی نے انتخاب کی اور پھر ترجمہ کر کے ہم تک پہنچائی۔ آپ اسے بار بار

پڑھ کر زندگی، تخلیق، درد احساس اور ہنرمندی کی کئی پرتوں کو اُلٹتے چلے جایئے۔ کہیں بھی، کسی بھی سطح پر آپ مایوس نہیں ہوں گے بلکہ اس خوبصورت نظم کا درد بھرا احساس آپ کو اپنے حصار میں لیتا چلا جائے گا۔

گبریلا کی نظموں کو جس خوبصورتی اور بھرپور توجہ سے عامر بن علی نے ترجمہ کیا اُس پر گہرے مطالعے اور بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح پابلو نرودا کی ایک نظم دیکھئے...... آپ کو یہ نظم کسی طور بھی ترجمہ کی گئی محسوس نہیں ہوتی۔ عجیب تخلیقی آہنگ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پابلو نرودا 1904 میں پیدا ہوا اور 1973 میں اس دنیا سے رُخصت ہوا مگر اس کی تخلیقات کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ اس کے اہم تخلیق کار ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

"غیر حاضری"

میں نے مشکل سے ہی تمہیں چھوڑا ہے
جب تام میرے اندر اُترتی ہو تو
مورتی بن جاتی ہو
یا پھر کانپتی رہتی ہو
یا پھر بے سکون
مجھ سے ہی گھائل
نہیں
تو پھر محبت سے سرشار
جیسے جب تمہاری آنکھیں
زندگی کے تختے پر بند
جو بغیر کسی وقفے اور رکاوٹ کے میں تمہیں
دیتا میں ہوں
محبت میں وصال کی آخری حدوں کے اس پار

سے مہکتی ہوئی تخلیقی سرشاری کو جس طرح پابلو نرودا نے بیان کیا عامر بن علی نے اس کو کسی بھی صورت ضائع نہیں ہونے دیا۔ وہ نہایت مشاقی سے اُس بیان کردہ منظر کے بین السطور کو چھوتا ہوا اُسے اردو زبان میں ترجمہ کرنے میں کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ ان تمام نظموں میں جو محنت اور کوشش عامر بن علی نے کی ہے اُن پر کھل کر لکھنے کی ضرورت بھی ہے اور اسے عام قاری تک پہنچانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ کیوں کہ آج کے انسان کو جمود سے نکال کر زندگی کے اصل حقائق سے جوڑنا ہماری بنیادی ضرورت ہے۔ علم و ادب کی روشنی کو عام کرنے والوں میں عامر بن علی بھی شامل ہے۔ اس کے اشعار، اس کی نظمیں، غزلیں، کالم سفرنامہ اورسب سے اہم اس کی ادبی Comitment جو ارژنگ کی صورت ادبی حلقوں اور قارئین ادب تک پہنچی ہے۔ اس کے خلوص اور محبت کا ثبوت دینے کے لیے کافی ہے۔ عامر بن علی ایک عمدہ تخلیق کار نفیس انسان ہے اور اس کی شخصیت کو اس کے فن کے آئینے میں پرکھنے سے اس کی ذات میں جھانکنا مزید آسان ہو جاتا ہے۔ وہ اندر سے کتنا انسان دوست، معصوم اور ہمدرد ہے یہ اس کی تخلیقات سے مکمل انداز میں منعکس ہوتا ہے۔ میں عامر بن علی کے لیے ایک دوست کی حیثیت سے دعا گو بھی ہوں اور اس حوالے سے مزید لکھنے کا وعدہ بھی کرتا ہوں۔

مشمولات

عمران نقوی بطور شاعر کا تھیسز
عامر بن علی کا مجموعہ محبت چھو گئی دل کو
آج کا جاپان...... سفرنامہ عامر بن علی
2012 تحقیق اقراء شوکت
محبت کے دو رنگ...... عامر بن علی

سامنے کی مثال ہے صاحب
عشق میرا کمال ہے صاحب
عشق ہوتا ہے زندگی جیسا
آپ کا کیا خیال ہے صاحب
وصل کے دن بہت ہی تھوڑے ہیں
ہجر تو لازوال ہے صاحب
درد دل میں کوئی چھپایا ہے
آپ کی آنکھ لال ہے صاحب
چھوڑیے آج میں نہیں کرتی
ایک میرا سوال ہے صاحب
یونہی اک بات کہہ گئی ہوں میں
ورنہ میری مجال ہے صاحب
کس کی خاطر سنبھال رکھا ہے
یہ جو پھولوں کا تھال ہے صاحب
زندگی لے چلی جہاں ہم کو
واپسی اب محال ہے صاحب
کوئی نظر کرم رہی مجھ پر
یہ جو حسن و جمال ہے صاحب
کوئی نظریں ملائے آپ سے کیا
رُخ پہ جاہ و جلال ہے صاحب
خواب میں آپ کا یہ آ جانا
ہجر گویا وصال ہے صاحب
ویسے اپنے الگ قبیلے ہیں
خون کا رنگ لال ہے صاحب

لبنیٰ صفدر/ پنڈی بھٹیاں

ستاروں سے بھرے باغات کا شاعر......احمد خیال

آفتاب خان/لاہور

برادرم احمد خیال نے 17 فروری 2016 کو اپنا شعری مجموعہ ''ستاروں سے بھرے باغات'' مجھے آواری ہوٹل میں عنایت کیا۔ مجموعہ کا سرسری جائزہ اور پہلا مطالعہ تو اُسی شب ہو گیا تھا اور اُس سے کافی حظ بھی اُٹھایا۔ مگر اسے بغور اور عرق ریزی سے قرات کرنے کے لیے بار بار اُٹھانا اور پڑھنا پڑا اور ہر بار اس شاعری سے لطف و انبساط کے نئے در وا ہوئے۔

''ستاروں سے بھرے باغات'' احمد خیال نے اپنے خیالات کی انوکھی دنیا بسا رکھی ہے جس میں ستاروں کے باغات بھی ہیں، جل پریوں کے آبی محل بھی ہیں، پریوں کا طلسماتی ماحول بھی ہے اور دھنک سے لبریز فضائیں بھی ہیں جن میں احمد خیال چل تو اکیلا رہا ہے مگر اُس کے پیچھے ایک قافلہ رواں دواں ہے جو اُس کے اشعار گنگناتا جاتا ہے اور ہواؤں میں نغمگی بکھرتی جا رہی ہے۔ ذرا یہ اشعار آپ بھی سنیں:

چادرِ آب کہاں کوئی بدن ڈھانپتی ہے
جل پری آج بھی ناکام ہے تن پوشی میں

....

اب پرستاں سے پلٹنا تھوڑا مشکل ہے مرا
اک پری سے پیار ہے تو دوسری سے عشق ہے

....

سنہری جل پری دیکھی تو پھر پانی میں کودے
وگرنہ ہم تو دریا کے کنارے جا رہے تھے

جسم کے ساتھ دل و جان بھی شاداب کروں
کاش مل جائے مجھے جھیل ہرے پانی کی

احمد خیال اپنے دل و دماغ کی کھڑکی ہر وقت کھلی رکھتا ہے جس سے تازہ ہوا کی آمد و رفت جاری رہتی ہے اور غیب سے مضامین من میں اُترتے رہتے ہیں۔ جنھیں احمد خیال اپنے شعری ہنر سے مترنم اور دل نشیں بحروں میں ڈھال کر سب کے سامنے پیش کرتا ہے۔ احمد خیال کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اس لیے اس کی شاعری میں نئی وارداتوں اور نئے خیالات کا ذخیرہ ہے جسے اُس نے ذہن کے گودام سے نکال کر تازہ کاری کی مالا میں پرو دیا ہے اور روایتی مضامین کو بھی نئے آہنگ سے ہم کنار کر ڈالا ہے اس لیے اس کے شعروں میں تازگی اور انوکھا پن بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش کرتا ہوں:

جھانکیے گا دل کسی درویش کا
اس مکاں میں لامکاں کے پھول ہیں

....

یہ ہے کہسار پہ بیٹھے ہوئے درویش کا فیض
بہتی رہتی ہے ندی نور بھرے پانی کی

....

کسی درویش کے حجرے سے ابھی آیا ہوں
سو ترے حکم کی تعمیل نہیں کرنی مجھے

....

تارکِ دنیا کسی درویش کو
کیا غرض ہے شاہ کے دربار سے

....

برسوں پرانی راہ گزر سے نکالیے
خود کو روایتوں کے اثر سے نکالیے

احمد خیال نے اپنے ہی مندرجہ بالا شعر پر عمل کرتے ہوئے خود کو روایتوں کے اثر سے نکالنے کی پوری کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہا ہے۔ اس نے نہ صرف پرانے مضامین کو نیا رنگ دیا ہے بلکہ نئی زمینیں بھی نکالی ہیں اور نت نئے استعارات کا بخوبی استعمال کر کے غزل کو نئے روپ میں ڈھالا ہے جس کی بنا پر احمد خیال کی غزل دور ہی سے اپنے منفرد انداز کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ اُس کی غزل کی ایک بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُس میں مضامین کی فراوانی ہے اور احمد خیال کی آنکھ کسی ایک منظر پر نہیں ٹھہرتی بلکہ وہ ستاروں سے آگے کے جہاں بھی دریافت کرنا چاہتا ہے اور زمین پر موجود مصائب و آلام سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ اس لیے اس کی شاعری میں نوع بہ نوع خیالات کی کہکشاں بکھری ہوئی ہے اور ہر انداز کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

بہت قریب زمانے کی بات ہے احمد
ضعیف مائیں ہمارے لباس بنتی تھیں

....

چاہے خمارِ عشق ہو یا پھر خمار ہے
دونوں ہی کا دماغ سے کچھ واسطہ نہیں

....

خود خدا نے قسم اُٹھائی ہے
یہ زمانہ خسارے اندر ہے

....

کچھ تو کھلے کہ کیا ہے ستاروں کے اُس طرف
اک در تو آسمان کا وا ہونا چاہیے

احمد خیال نے ''ستاروں سے بھرے باغات'' میں کئی جگہ باغ کی بات بھی کی ہے۔ اسے باغات سے دلی محبت ہے۔ چاہے وہ ستاروں کے باغات ہوں یا پھولوں کے باغات یا پھر جنت کے باغات کا تذکرہ ہو۔ وہ باغات میں وقت گزارنا چاہتا ہے لیکن اپنے باوا آدم کی طرح اُسے باغات کے بعد زمین کے صحراؤں کی خاک بھی چھاننی پڑی ہے۔ سو اس مجموعے میں دشت و صحرا کا ذکر بھی اُسی قدر ہے جس قدر باغات کا ہے۔ جب وہ تنہائی اور وحشت سے گھبرا جاتا ہے تو صحرا ہی اُسے پناہ دیتا ہے۔ ذرا باغ اور صحرا و دشت کے حوالے سے اشعار کا مطالعہ کیجیے۔ یہ بالکل صنعتِ تضاد والی کیفیت کا معاملہ ہے لیکن آپ دونوں کیفیات سے لطف اندوز ہوں گے۔ ملاحظہ کریں:

خوشبو تمہاری ذات میں اُترے گی ایک دن
اپنے مہکتے باغ سے کچھ استفادہ کر

....

ہر گام اُس طلسم کہانی میں آگ تھی
آتش میں ایک باغ تھا، پانی میں آگ تھی

اگر پہنچے فلک تک ہاتھ میرے
ستاروں سے بھرے باغات میرے

....

خوب تسکین سی ہوتی ہے یہاں وحشت کی
مجھے کچھ پہلے ہی صحراؤں میں آ جانا تھا

....

میں کہ اک دشت کا باسی ہوں کئی صدیوں سے
خوف سا آتا ہے پانی میں قدم رکھتے ہوئے

....

مجنوں کے ذمے دشت میں کتنے ہی کام ہیں
اُس شخص کا فراغ سے کچھ واسطہ نہیں

احمد خیال کی یہ شاعری دل کے تاروں سے دھیمے دھیمے سروں میں نکلتی ہوئی جھنکار ہے جو موجودہ اور آئندہ زمانوں کے صاحبانِ ذوق کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور اسے پڑھ کر شاعری کی جادو بیانی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ احمد خیال نے میرے عہد میں جنم لیا اور مجھے مشاعروں میں اس کی شاعری سننے کے علاوہ کتابی شکل میں بھی پڑھنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ آج کے معدودے چند منفرد شاعروں میں احمد خیال کو بھی نمایاں جگہ ملنی چاہیے۔ اس کے طرزِ اظہار میں تازگی اور ندرت ہے ورنہ آج کل کے شعری مجموعوں میں اس قدر عمدہ اشعار نہیں ملتے جتنے اس مضمون میں شامل ہیں اور ان سے بھی زیادہ کتاب میں موجود ہیں۔ آخر میں احمد خیال کے دو نمائندہ اشعار درج کر کے اجازت:

اے یار! تخی یار مجھے اور بھی دکھ دے
ان سے تو مری آنکھ بھی گیلی نہیں ہوتی

رستہ بھی جدا ہے مری منزل بھی الگ ہے
آواز سے آواز ملانے کا نہیں میں

گوجرانوالہ میں مقیم نامور شاعر
جان کاشمیری کے دس تازہ شعری مجموعے

روئے غزل
قیمت: -/500روپے

چاندرات والی بات
قیمت: -/500روپے

زمانے کی چھوڑو زمانہ کدھر ہے
قیمت: -/500روپے

ڈوبتے ہاتھ کی فریاد
قیمت: -/500روپے

دوزخ میں آبِ کوثر
قیمت: -/500روپے

خلوت کے بعد
قیمت: -/500روپے

حیرت سے آگے
قیمت: -/500روپے

جنت میں خودکشی
قیمت: -/500روپے

ژرف نگاہی
قیمت: -/500روپے

ماورا، 60-دی مال، لاہور

جنید آزر کا بت خانہ سخن

نازبٹ/لاہور

جنید آزر کی شاعری ذات کے آتش کدے میں ماضی، حال اور مستقبل کے کرب کا الاؤ ہے اور اس الاؤ سے نمایاں ہونے والے امکانات دل پر نالہ ء پُر تاثیر کی طرح چڑھ جاتے ہیں، حدیث دل کے باب روشن ہونے لگتے ہیں اور صحنِ وجدان میں وہ رمق روشن ہونے لگتی ہے جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شاعر کی توفیقات کی استعداد کیا ہے، جن عوامل کے ردِ عمل میں جنید آزر جبر و مقدر کی سنگلاخ زمینوں میں تخم سخن بونے کی سعی کر رہا ہے وہ خود اپنی جگہ پر ایک جاں گسل عمل ہے۔ جنید آزر کی شاعری کا کم و کیف کیا ہے اور کن وجوہات سے صدمہ ء اضداد کو نوکِ خامہ ء قلم پر انا الحق کے متوازی نعرۂ مستانہ اٹھانا پڑا ہے، جنید آذر جذبات کی ذہری، تہری سلائی کو ادھیڑنے کا سلیقہ رکھتا ہے، وہ گل و راغ و باغ کی پتا پتا سکھیا جانتی بہار کا ہر رنگ جانتا ہے۔ وہ خواہش نمو اور نمو کی ہوس کے سارے رازوں کا امین شاعر ہے:

"رویا ہوں بہت سبزہ ء خواہش کی نمو پر
جب پاؤں مرا سوکھی ہوئی گھاس پہ آیا"

"سانسوں سے روندتا ہوں تمنا کے ریگزار
جب سے مری سپاہ میں ہے میرا دشت سبز"

لفظ کو لفظ کی پرت سے نکالنا اور معنی کو معنی کی کوکھ سے کھوجنا، اس شرط پر کہ زندگی کی ریشم سچائیوں اور فولاد حقیقتوں میں التباس پیدا نہ ہو، آسان نہیں ہوتا لیکن جنید آزر کی سرمستی شعر ایک کوہ کن کی ضرب ہے جو جوئے شیر کھودنے کے درپے ملتی ہے اور یہ اعتماد سخن جو اس کے شعروں کے پس پردہ چل رہا ہے۔ یہ اعتماد ریاضتِ فن کی بھٹی میں ایک عمر جلے بغیر کیسے ممکن ہے۔

"تعین خود کرے گا راستوں کا
مرے دریا کو بہنا آ گیا ہے"

جدھر سے روک رہی ہے مجھے تری خواہش
عجب نہیں کہ یہ دنیا ادھر نکلنے لگے

سچا شاعر وہی ہوتا ہے جو حواس خمسہ کو ایک دوسرے پر الٹ کر ایک نئی خوشبو کشید کرتا ہے تب اس پر اسرار ہستی الہام و وحی کی طرح اترنے لگتے ہیں اور حقیقتیں وجدان کے نوکِ قلم پر الوہی ترانہ پڑھنے لگتی ہیں۔ فنا و بقا کے نصاب اور اس سے بے خبری کی خبر ملتی ہے۔

"پہلے مری فنا پہ لئے میرے دستخط
تب جا کے ممکنات میں رکھا گیا مجھے
خوشبو کے نام پر مری سانسیں کشید کیں
موسم کے انحطاط میں رکھا گیا مجھے"

اور یہ شعر دیکھئے گا۔۔۔۔۔۔۔

"ہمیں اس خاک سے اٹھنا ہے کس دن
ہمارا آب و دانہ کس جگہ ہے"

جنید آزر کی شاعری روایت سے وابستہ ہو کر مہکتی نظر آتی ہے اور جذبہ و خیال کے در و بست پر دستک دینا اسے خوب آتا ہے کہیں کہیں جنید آزر جذبہ اور تفکر کو باہم آمیخت کر کے اک نئی اقلیم کا راستہ سجھاتا ہے اور کوئی ایسا حیرت انگیز شعر کہہ دیتا ہے جس کا لب ولہجہ کائناتی اور آفاقی ہوتا ہے۔

"سو کہ اٹھتا ہوں تو دیوار نئی ہوتی ہے
رات کھا جاتی ہے خوابوں کو سحر ہونے تک"

"ہم نے ساری زندگی اس پر ہی چلتے کاٹ دی
جس زمیں پر پاؤں کے نیچے کوئی رستہ نہ تھا"

عمر کو رائیگانی کی مسافت میں گھلا دینا بے شوریدہ سری ء عشق اور جنوں بھی ہو سکتا ہے لیکن با مقصد راستوں میں شہید کرامت معنی ہونا مستند حوالوں کو جنم دیتا ہے اور شعری تاریخ کا ورثہ بڑا کرتا ہے۔ جنید آزر کو اپنے اس منصب کی قدر و قیمت کا پتہ ہے جس کی وجہ سے وہ لہلہا رہا ہے:

"تخم امید سے یہ عہد کیا تھا میں نے
دھوپ میں جلتا رہوں گا میں شجر ہونے تک"

زوال عہد حاضر اور استقبال عصر آئندہ کن شرائط پر میسر آتا ہے اور نئی نسلوں پر اس کے کیا اثرات نکلتے ہیں جنید آزر کا زرخیز وجدان اسے بخوبی جانتا ہے، وہ اپنے خوابوں اور ان کی دن میں دیکھی تعبیروں کو سیر حاصل آئندہ کے عنوان سے رقم کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری خوب ادا کر رہا ہے:

"بزرگوں کی شبیہیں ہیں مرے بچوں
کے چہروں میں
میں ماضی کے حوالوں کو ہی مستقبل سمجھتا ہوں"

اور کہیں کہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"پہلی ہی نسل کے ابھی اترے نہیں ہیں قرض
"کھانے لگا ہے کیوں غم آئندگاں مجھے"

جنید آزر زندہ احساس، زرخیز وجدان اور چشم بینا کا مالک ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس کے تجربے صادق اس کے قول مستند ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اگر انسان جذبہ ء تخیل میں بھی اپنے سچ کی آبرو نہیں کرے گا تو وہ اپنے تفکر آمیز عمل میں کیسے نمو کرے گا؟ جنید آزر کے یہاں یہ آمیختہ جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

"میں ایسی بات بھلا کیسے مان سکتا ہوں
فقیر رقص کرے موج میں دھمال نہ ہو"
میں کیا کروں گا چمکتے ہوئے ستاروں کو
مری نظر میں اگر روشنی بحال نہ ہو

جنید آزر ایسا حساس شاعر ہے جو درد و کرب کے احساس کو اپنی پلکوں سے چنتا ہے اور آنکھوں کے راستے اپنے وجود میں جذب کرتا ہے۔۔۔ اس انجذاب میں جب اس کا دم گھٹنے لگتا ہے تو وہ اس کرب کو۔۔۔۔ احساسِ دروں کی دھیمی دھیمی لو میں قطرہ قطرہ پگھلتے لفظوں کی صورت سپردِ قلم کرتا ہے۔

مجھ سے گیلی ہوا لگ کے روتی رہی
میرے سینے میں جنگل اگا رہ گیا
اتنی شدت سے میں نے پکارا اسے
میری آواز پر آبلہ رہ گیا

کوچ کر جائیں گے زنداں سے اسیرِ آرزو
اک تعلق درد کا زنجیر سے رہ جائے گا
پیاس میری پانیوں پہ تیرتی رہ جائے گی
میری حسرت کو سمندر دیکھتا رہ جائے گا

جنید آزر کو ادراک ہے کہ اس کی شاعری میں تلخی کی شدت زیادہ ہے اور وجہ حد درجہ حساسیت ہی ہے۔

"ہوا نہیں تو یہ ممکن ہے ہونے لگ جائے
ہوا چراغ کا دُکھ سن کے رونے لگ جائے
یہ کیسا ڈر مجھے ورثے میں مل گیا آزر
جو ذرا جگاؤں تو دیوار سونے لگ جائے"

جنید آزر کی شاعری ایک خاص قسم کی معنویت، خاص قسم کے احساس، خاص قسم کے کائناتی مشاہدات پر مشتمل ہے۔

کوئی سورج سے کہاں آنکھ ملا سکتا تھا
یہ تو ہم تھے جو نکل آئے اسے چھونے بھی

جنید آزر حقیقت پسند شاعر ہے، جس کی نظر گہری اور مطالعہ عمیق ہے تبھی تو وہ کہتا ہے۔

چپ چاپ اُترتا ہوا اک ضعف کا موسم
میں جسم کی تختی پہ لکھا دیکھ رہا ہوں

جنید آزر الفاظ کو برتنے کا فن خوب جانتا ہے۔اس کے ہاں جذبے کی گہرائی، گیرائی، سچائی، اظہار کا قرینہ، شعری وجدان، استحکام، عملی و نفسیاتی ادراک سب کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ پرانے موضوعات کو نئے انداز میں بیان کرنے کا فن جانتا ہے۔

میں اعتکاف میں بیٹھوں گا ایک شب کے لئے
پھر اس کا کشف مرے جسم و جاں سے جھانکے گا
مجھے اتارا گیا بے زباں قبیلے پر
سو میرا کرب کسی کے بیاں سے جھانکے گا"

جنید آزر نے اپنی شاعری کو صرف ہجر و وصال، گل و بلبل تک ہی محدود نہ رکھا۔۔۔۔۔۔۔اس کا دکھ آفاقی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔زمینی حقائق سے جڑا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ خود کہتا ہے:

"کوئی بھی با شعور شخص اپنے ماحول اور معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا دوسروں کی طرح میں بھی اسی معاشرے کا حصّہ ہوں۔ مجھے بھی اس معاشرے کی تمام تلخیوں اور مٹھاس کا ذائقہ اپنی زبان پر محسوس ہوتا ہے"

جنید آزر اپنے اطراف پھیلی۔۔۔۔۔۔۔۔ معاشرتی ناہمواریوں کا دکھ اپنے دل کے نہاں خانوں میں سمیٹے کہتا ہے:

میں بھوک تو آنکھوں میں خواب رکھتے ہیں
ہم اپنے بخت میں دُھرا عذاب رکھتے ہیں

جو لکھ رہا ہے مقدر کے حاشیے آزر
اسی کے نام سبھی اقتباس رکھتے ہیں

جنید آزر کے ہاں حساسیت کی انتہا دیکھئے:

"بوڑھے شجر سے آخری پتے کا دکھ نہ پوچھ
اندھی ہوا کا خوف ہے لرزاں کئے ہوئے"

اسکی شاعرانہ قوتِ تجزیہ شاندار ہے، جب وہ اطراف کی صورتحال پر نظر کرتا ہے تو اس کا جی کڑھتا ہے ایسے میں اسکا وجدان پکار اٹھتا ہے:

"ہم لوگ کمک مانگنے لگتے ہیں ہَوا سے
ہم پر جہاں کھلتا نہیں دروازہ سفر کا"

شاعری وضاحت ہے، سلیقہ ہے۔ بشر کے ذاتی اور وجدانی المیہ کا منظم بیان ہے کس سہولت اور تخلیقی مہارت کے ساتھ وہ اتنا بلیغ شعر کہہ جاتا ہے:

"کہیں ورثے میں اندھی خواہشیں پروان چڑھتی ہیں
کہیں زندوں کو مُردوں کی وصیت مار دیتی ہے"

محبت اپنی تمام تر کوملتا اور کسی نیم خوابیدہ احساس کی طرح اس کے اردگرد دھڑلے میں رقصاں ہے:

ھوا کے دوش پہ خوشبو کو دنگ کرتا رہا
میں اسکے خوابوں پہ آنکھوں سے رنگ کرتا رہا
تھا دسترس میں مری اُس کا ابر جیسا بدن
میں سورجوں کی طرح سے ترنگ کرتا رہا"

یا پھر یہ اشعار دیکھئے:

"خوشبو کی طرح مست بہار بدن میں رہ
اچھا ہے تھوڑی دیر خمارِ بدن میں رہ
میں بھول ہی نہ جاؤں ترے لمس کی مہک
میں چاہتا ہوں یوں ہی خمارِ بدن میں رہ

جوں جوں ہم اس کی لطیف شاعری کی پرتوں کو کھولتے چلے جاتے ہیں جنید آزر ہمیں صنم تراشی کے ایسے معبد میں لے جاتا ہے جہاں اسکی چشمِ تخیل اپنے دیکھے ہوئے خوابوں اور۔۔۔۔۔۔۔ اس کی سانسیں اپنے وجدان کے چکھے ہوئے آمیزوں کو اگل رہی ہوتی ہیں ایسی ہی شاعرانہ لطافتوں سے مزین، نرم کیفیت میں ڈوبی نظم:

خواب کا اک منظر"

"خواب نے اپنے بوسے مری آنکھ پر رکھ دئے

اور منظر بدلنے لگے

ایک پل میں زمیں آسماں کے کناروں کو چھونے لگی

زہر امرت بنا

زندگی کی حرارت رگ و پے میں اتری تو خواہش کی آنکھیں کھلیں

زندگی میرے سینے میں کب سے مقید تھی

اور سانس لیتی تھی۔۔۔۔۔۔

دل میں دھڑکتی تھی پر زندگی تو نہ تھی

پھر اچانک کسی مرمریں ہاتھ کا لمس سینے پہ اترا تو ایسا لگا

جیسے بے جان پتھر میں جاں پڑ گئی۔۔۔۔۔

اک چشمِ دل افروز کا عکس دل پہ پڑا

رنگ اور روشنی کے معانی کھلے

سایہء سبز سر پر ردا بن گیا

خواب نے اپنے بوسے مری آنکھ پر رکھ دیئے

معجزہ ہو گیا۔۔۔

یہاں لطافت خیال اور نازک احساس کا ایک اور شعر بھی دیکھتے چلیں:

"تم ہو نازک خیال کی مانند

تم کو چھوتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں"

جنید آزر کی شاعری میں سہل ممتنع کی مثالیں جا بہ جا ملتی ہیں۔۔۔شعر پڑھیے اور سر دھنتے جایئے:

"میرے لب پر سوال آتا نہیں

آپ کو خود خیال آتا نہیں"

یا

"ہم نے مانا تمہیں عزیز نہیں

دل مگر توڑنے کی چیز نہیں"

یا پھر:

کس طرح سے بچیں گے نظروں سے

لوگ تو ہر جگہ پہ ہوتے ہیں

یہاں چند اشعار دیکھئے جو جنید آزر کی شاعری کے مختلف فکری رنگ بکھیر رہے ہیں:

کھینچے گا کہاں اُس کو مرا سادہ تکلم

وہ شخص ابھی چرب زبانوں میں گھرا ہے"

"میں پھول بانٹتا رہتا ہوں شہر والوں میں

پھر ان کے ہاتھ میں پتھر کہاں سے آتے ہیں

سحر کا نور نہیں شام کا اجالا نہیں

بصارتیں مری بینائی کا حوالہ نہیں

ایک باشعور، عاقل و بالغ تخلیق کار کی طرح ملکی سطح پر ہونے والے سانحات و واقعات شدت سے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی شدت سے وہ اس کرب کی ترسیل بھی کرتا ہے۔۔۔اس کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی نخلِ سرسبز کی طرح تر و تازہ ہے۔۔

میں اپنی ذات پہ مرتا رہا سمٹتا رہا

مرا وطن پہ تو سارے وطن میں پھیل گیا

اور کہیں وہ ساری زندگی کی کمائی اپنی شہرت، اپنے نام و نسب کو ٹھوکر مار کر کہتا ہے:

کیا مرا نام و نسب کیا مری ہستی آزر

اتنا کچھ، کچھ بھی نہیں اپنے وطن سے ہٹ کر

جنید آزر کی پہلی شعری کاوش "کاغذ کی راکھ" 1998 میں منظر عام پر آئی جسے سردار عبدالرب نشتر ایوارڈ اور گورنر سرحد نے گولڈ میڈل سے نوازا۔اس کے علاوہ متعدد اعزازات جن میں "الکرم میلینیم ادبی ایوارڈ "2000، "بزم اردو بریڈفورڈ کی جانب سے ادبی ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں، سے نوازا جا چکا ہے۔ دوسرا شعری مجموعہ "اشارہ" 2008 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ 2 تحقیقی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔

جنید آزر کی شاعری کا مطالعہ ہمیں اس کی متنوع فکری جہات سے روشناس کراتا ہے۔ آئندہ دنوں میں وہ اپنے لب و لہجے کی انفرادیت کو کتنی وسعتوں سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوتا اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا مگر امکانی طور پر اس کے روشن شعری مستقبل کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ شاعری اور بالخصوص غزل ہر شاعر کو اپنے دامنِ قبولیت میں جگہ نہیں دیتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ جنید آزر شعرا کے اس کارواں کا حصہ ہے جس کے سر پر غزل اپنا سایہ کرتے ہوئے تنگ دامنی اور بخیلی کا مظاہرہ نہیں کرتی۔

خوبصورت جذبوں کا شاعر......رائے عابد علی

محمد حنیف رائے

رائے عابد کی شاعری سچے جذبات کا سادہ اور سچا اظہار ہے۔ ان کی غزلوں میں لفاظی اور بناوٹ نہیں۔ وہ دھرتی کے سینے پر بسنے والی خلق خدا کے دلوں کی دھڑکنوں کے شناور ہیں۔ ان کے کلام میں ویسی ہی نغمگی پائی جاتی ہے جو کھلے کھیتوں اور کھلیانوں میں پکے راگ گانے میں اُستادوں کی نزاکتوں کی بجائے خانہ بدوشوں اور صحرا نشینوں کے گائے ہوئے گیتوں جیسا لوچ ہے۔

ان کی شاعری کا بیج ان کھلے پھولوں کی طرح پوتر اور اپنی تمام تر ندرتوں، نکہتوں اور بے نظیر جذبوں کا عکاس بھی ہے اور اس دشتِ بے کراں میں اپنی محرومیوں، تنہائیوں تشنہ لبی اور آبلہ پائی کا مرثیہ خواں بھی۔

فنی صفات میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے ان کا کرب آمیز تفکر جس میں ان کے بدن دریدہ جذبے، سربرہنہ خواہشات، زخم کھانے اور مسکرانے کی دُھن نمایاں ہے۔

رائے عابد کی شاعری میں پتھر، دریا، خیمہ، ریت، کربلا، آنسو، چاندنی اور رتجگوں کے حوالے سے استعارے موجود ہیں۔ محسن نقوی کو شعر وادب میں اپنا مرشد مانتے ہیں۔ رائے عابد کے دوشعر قارئین کی خدمت میں:

مرے سب داغ عصیاں ڈھل گئے شبیرؑ کے صدقے
میرے دامن پہ جب ٹپکا بنامِ کربلا آنسو
جو میں نے زندگی بھر کی ریاضت کا صلہ مانگا
مری خالی ہتھیلی پر کسی نے رکھ دیا آنسو

بہرحال تمام باتوں کو سمیٹتے ہوئے ان کی شاعری میں پیار کے نئے جذبوں کی دھنک، چاہتوں کی کھنک کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی ناہمواریوں، محرومیوں کی چبھن کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کیا خوب لکھتا ہے:

اپنے اندر خواہشوں کی بارہا ترمیم کی
پھر بگڑتے کیوں گئے قسمت کے تیور اور بھی

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

نمونہ کلام رائے عابد علی:

جب بھی منزل کی طرف پاؤں اُٹھایا ہم نے
راستہ گرد کی مانند اُڑایا ہم نے
ہم نے چھوڑا نہ کبھی صبر و رضا کا دامن
ہاتھ پھیلائے نہ کشکول اُٹھایا ہم نے
اک زمانہ ہوا، اک نام لکھا تھا دل پر
آج تک مٹ نہیں پایا، نہ مٹایا ہم نے
تاکہ سقراط کا پیغام بھی پہنچے گھر گھر
زہر ہر کرب کا اشکوں کو پلایا ہم نے
ہم کو ہر زخم ہی اپنوں سے ملا ہے عابدؔ
غیر کے ہاتھ سے پتھر نہیں کھایا ہم نے
روز ہم دھوپ کے صحراؤں میں سلگے عابدؔ
روز زیتون کا اک پیڑ لگایا ہم نے

....

کوئی مرحلہ نہیں طے ہوا تیری یاد کا
ہے رواں دواں ابھی قافلہ تیری یاد کا
مجھے جانِ جاں ابھی زندگی کا یقین ہے
مرے ساتھ ہے ابھی رابطہ تیری یاد کا
وہی جستجو وہی آرزو تیرے قرب کی
وہی گفتگو وہی تذکرہ تیری یاد کا
میرے خال و خد پہ بھی دھول سی ہے جمی ہوئی
یہ بتا گیا مجھے آئینہ تیری یاد کا
انھی راستوں پہ چلے تھے ہم، مجھے یاد ہے
انھی راستوں میں ہے راستہ تیری یاد کا
تیری جستجو میں ہوں دور تجھ سے نکل گیا
میرے ساتھ ساتھ ہے فاصلہ تیری یاد کا
میرے ذہن و دل کئی دائروں میں بٹے ہوئے
سبھی دائروں میں ہے مرکزہ تیری یاد کا
مرے نام کی تو نکال دے کوئی فال اب
میں بنا کے دوں تجھے زائچہ تیری یاد کا

سائیں ...... ندرتِ تخیل کا وجد آفرین مظہر

تفاخر محمود گوندل

موجودہ دور اگرچہ مادہ پرستی اور جلبِ زر کی تمنا کے حوالے سے بڑا بے مایہ سا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے لگام خواہش نے روایتی علمی و ادبی گھرانوں کے چشم و چراغوں کے ادبی سوتے خشک کر دیے ہیں۔ مگر اس کم مائیگی کے باوجود بھی شعر و سخن کے میدان میں نئی نئی اصنافِ سخن ایک نئے انداز سے متعارف کروانے کا اہتمام بھی جاری ہے۔ اس ضمن میں برادرم حسن عباسی کے اشہبِ قلم کی جولانیوں نے ''سائیں'' کے نام سے ایک ایسی نادر الوجود تخلیق منصۂ شہود پر متعارف کروا دی ہے جس کے شاعرانہ اسلوب نے سرپرستانِ علم و فن کو چونکا دیا ہے۔ بادی النظر میں یہ ایک حمدیہ کاوش معلوم ہوتی ہے اور فی الحقیقت ہے بھی خدائے بزرگ و برتر کی توصیف و ثناخوانی۔ لیکن دراصل عباسی صاحب نے اس کے ساتھ ساتھ باذوق قارئین پر ایک اور کرم فرمائی بھی کی ہے یعنی تشبیہات و استعارات، رموز و کنایات اور اوزان و بحور کا ایک کامل نظامِ سخن بھی متعارف کروا دیا ہے۔ مجھ ایسا سخن ناشناس اور کم فہم انسان اگر مبادیاتِ شعر گوئی اور لوازمِ ریختہ سے واقف ہوتا تو اس کے فنی اسرار سے خود بھی حظ اُٹھاتا اور حالی کی طرح اس کی فصاحت گداز سے قارئین کو بھی آگاہ کرتا۔

یہ ایک ایسی خوبصورت اور نفیس کاوش ہے جو فنی ارتقا کے خواہش مند باذوق قارئین کو اپنی نئی جہتوں کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ موجِ خرامِ یار اپنے دل فریب اندازِ نقشِ پا کی بنیاد پر رہروانِ شوق کو منزل کی جانب گامزن کر دیتی ہے۔ ''سائیں'' صرف اپنے خالق و مالک کی بارگاہِ قدس میں نذرانۂ حمد و ثنا ہی نہیں بلکہ اُس کی مخلوق کے ساتھ امتدادِ زمانہ کی قہرمانیوں، سلاطینِ وقت کی رعونت و خشونت اور ہوس ناکیوں، سطوت و شوکت کے تمنائیوں کی بے محابا آرزوؤں، سماجی ناہمواریوں، اخلاقی پستیوں اور خلوص و وفا کی ناقدر شناسیوں کا ایسا جگر فگار آمیختہ معلوم ہوتی ہے جو مقصدِ تخلیق پر تدبر و تفکر کرنے والوں کے احساسِ مروّت کو دعوتِ فکر دے رہی ہے۔

میں نے ''سائیں'' کو ایک بار نہیں کئی بار دل و دماغ کے دریچوں کو کھلا رکھ کے پڑھا ہے۔ ہر بار اس کی گہرائی اور گیرائی میں ایک طوفانِ خاموش پابند ساحل نظر آتا ہے۔ آئیں آپ کو ذرا اس دنیائے حقیقت کی سیر کروا دوں۔ درج ذیل دو اشعار مجھے بار بار کپکپا دیتے ہیں اور میں شجر بید کی طرح لرزنے لگتا ہوں:

تیری دنیا صاف ہے کتنی
ہم ہیں کتنے گندے سائیں
رونے کی توفیق دے ہم کو
اپنے دل ہیں میلے سائیں

کہنے، دیکھنے کو یہ دو اشعار سادہ سے معلوم ہوتے ہیں مگر جہانِ فکر و تدبر کے مکینوں کے جذبات و احساسات کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ شانِ جمالِ خداوندی سے لبریز پہلا مصرعہ کس دل فریبی اور شانِ استغنا کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شاعر نے محاسن خالق ارض و سما کو اپنی انتہاؤں تک لے جانے کی انوکھی کاوش کی ہے۔ جو ناقابل تردید حقیقت ہے اور اس کی واضح برہان حضورؐ کا یہ فرمانِ ذیشان ہے کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

مگر حسن عباسی صاحب نے دوسرے مصرعے میں خلقِ خدا کے چہرے سے بھی پردہ سرکا دیا ہے کہ جس عالم رنگ و بو میں ہم اپنے شب و روز گزار رہے ہیں، کیا وہ بھی کسی آئینہ نفاست کے پیکر ہیں یا نہیں! ہم اپنے اخلاقیات و مبادیاتِ حیات، طرزِ تمدن، نشست و برخاست، غرض ہر زاویہ ہائے زندگانی کے اعتبار سے پستیوں کی طرف تو نہیں لڑھکتے جا رہے۔ اشرف المخلوقات کا تاج سر پر سجانے کے باوجود انسانی عز و شرف کو جس طرح پامال کرنے کے طریقے اختیار کر رہے ہیں اُس سے تو طاغوت بھی اعترافِ کمال پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور پھر ذرا اس شعر میں پائے جانے والے گداز آفرین تاثر کو دیکھئے:

رونے کی توفیق دے ہم کو
اپنے دل ہیں میلے سائیں

یعنی ہماری جبینوں پر اپنی کج ادائیوں اور

ستم ظریفیوں پر ندامت وخجالت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ حالانکہ اس کی رحمت خطا کاروں کو معاف کرنے کے لیے اس طرح بے چین رہتی ہے جس طرح پھول کی آغوش میں نکہت بے قرار رہا کرتی ہے۔ حسن عباسی صاحب کی ''سائیں'' تمام کی تمام حقائق ومعارف کا ایسا معدن ومخزن معلوم ہوتی ہے جس میں پائے جانے والے جواہرات کی تابش سے جبین حقیقت چمک چمک اُٹھتی ہے۔ میں عباسی صاحب کی حقیقت پسندی، الوالعزمی اور حمیت وبسالت کو دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے سلام پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے زبانِ خلق خدا سے ''اعترافِ جرم'' کروا کر اُسے اللہ کی رحمت کی وسعت کا احساس دلایا ہے۔ ''سائیں'' کا ایک اور منفرد پہلو بھی ہے کہ اس کے اشعار میں آبشار کے سے بہاؤ کا تسلسل اور طائرانِ فطرت کی نغمگی کا ایسا احساس جھلکتا ہے جو بین وسرود وبربط وعود و رباب وچنگ کا وجد آفرین اظہار معلوم ہوتا ہے۔ ہر شعر اندازِ تغزل کے ساتھ قوسِ قزح کے رنگ بکھیر رہا ہے۔ میں نے موسیقیت میں ڈوبے ہوئے اشعار بہت کم دیکھے ہیں۔ میرا نشترِ تنقید ''بڑے بڑوں'' کے اسقامِ فن کو معاف نہیں کرتا۔ مگر حسن عباسی کے ساحرانہ کلام نے مجھے عروسِ محبت کی عشوہ طرازیوں میں کچھ اس طرح جکڑ لیا ہے کہ تنقید کا ہر پہلو میری نوکِ قلم سے دور ہوتا چلا گیا اور یہ بات میں کسی تصنع کے بغیر عرض کر رہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ میدان شعر گوئی کا یہ بانکا شاہسوار تا دیر سلامت رہے تا کہ ''سائیں'' کی سی تخلیقات منظر عام پر جلوہ گر ہوتی رہیں۔ (آمین)

ارژنگ

آخر میں سائیں میں سے چند پسندیدہ اشعار:

جس کی تجھ تک رسائیاں سائیں
ہیں اُسی کی کمائیاں سائیں
اتنی باتیں ہمیں پتہ ہیں فقط
جتنی تو نے بتائیاں سائیں
تیرے ہوتے بھی تیری دنیا میں
ہو رہی ہیں خدائیاں سائیں

تفاخر محمود گوندل کی میراثِ قلم

تجلیاتِ رسالت ﷺ (سیرتِ طیبہ نثری کاوش)
جلوہ ہائے جمال (سفرنامہ حجاز)
معارف العباد (نثری کاوش)
نکہتِ نور (نعتیہ مجموعہ)
گیسوئے برہم (غزلیات)
غمزۂ خوباں (نعت، غزلیات)
اقبالؒ اہل بیتؓ کے حضور (زیرِ طبع)
طلاقتِ لسانی (فنِ خطابت)

ماورا، 60- دی مال روڈ، لاہور

اتنا سوچا ہے رقص کرتے ہوئے
خود کو سمجھا ہے رقص کرتے ہوئے
وجد میں کائنات ہوتی ہے
میں نے دیکھا ہے رقص کرتے ہوئے

پاؤں تھمنے سے پہلے ٹل جائے
جو بھی سوچا ہے رقص کرتے ہوئے
رقص کرتا ہوں جس کی چاہت میں
مجھ میں ہوتا ہے رقص کرتے ہوئے
ڈھول بجتا ہے دل کی دھڑکن میں
ایسے لگتا ہے رقص کرتے ہوئے
روح ٹھیکا لگائے طبلے پر
دل تھرکتا ہے رقص کرتے ہوئے
سانس بجتا ہے گھنگرو کی طرح
من مچلتا ہے رقص کرتے ہوئے
تا دھی دھنا بنے ہیں خواب مرے
دن نکلتا ہے رقص کرتے ہوئے
دھا تر رکو دھن تا بدن بولے
بھاؤ بنتا ہے رقص کرتے ہوئے
ہونٹ بجتے ہوئے نظر آئے
کون سنتا ہے رقص کرتے ہوئے
جب گئی ہے تو یونہی گزرے گی
عشق کہتا ہے رقص کرتے ہوئے
رقص میں عشق جب سما جائے
بات کرتا ہے رقص کرتے ہوئے
یہ بتایا ہے پھر نجومی نے
جینا، مرنا ہے رقص کرتے ہوئے
پھر بھی رقاص بن نہیں پایا
سانس اُکھڑا ہے رقص کرتے ہوئے

انیس احمد/لاہور

کالم

خلیل جبران سے احمد عدنان طارق تک......

حافظ مظفر محسن/لاہور

نارمن وزڈم، جیری لیوس یہ مزاحیہ فلموں کے ہیروز تھے جن سے میں اسکول/کالج کے زمانے میں متاثر تھا ان کی مزاحیہ فلمیں مجھے اچھی لگتی تھیں اور میں دیر تک یہ فلمیں دیکھ کر ہنستا رہتا۔ پھر میرے لڑکپن کے دور میں "مون ریکر" نامی فلم آئی یہ 007 سریز کی تھی اور میں جیمز بانڈ کی اس فلم کے سحر میں دیر تک رہا۔ پھر "بن حر" میں کھو سا گیا اور طویل عرصہ تک کھویا رہا...... یہ چھ گھنٹوں میں دیکھی جانے والی نہایت ہمت والے لوگوں کی فلم تھی......کالج کے زمانے میں ولیم ورڈز ورتھ کی نظمیں مجھے متاثر کر رہی تھیں اور یہ شخص میرے اعصاب پر سوار رہا......مگر جب زمانہ کالج کے آغاز میں والد صاحب نے مجھے خلیل جبران کی ساری کتابیں لا کر دیں تو مجھے لگا جیسے میں بیروت کے مضافات میں (بیروت خلیل جبران کا دیس ہے) کہیں رہتا ہوں اور چھوٹی پہاڑی پر قبر (خلیل جبران عیسائی مذہب سے ہے) میں لیٹے خلیل جبران سے ہر شام دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہتا ہوں...... میں نے جب پڑھا کہ خلیل جبران کی کتاب "Broken Wings" دنیا میں قرآن پاک کے بعد پڑھی جانے والی بڑی کتاب ہے تو میں نے پھر سے خلیل جبران کی کتاب "Broken Wings" نکالی اور بار بار پڑھنے لگا...... مجھے آج احمد عدنان طارق کی تحریریں پڑھ کر خلیل جبران کا انداز یاد آ جاتا ہے......

پھر جب کالج کے ابتدائی دنوں میں میرزا ادیب کی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" میرے ہاتھ آئی تو میں نے اُس خوبصورت ترین تحریروں سے مزین کتاب کا کچومر نکال دیا۔ پھر "صحرا نورد کے رومانس"، "مٹی کا دیا" ...... یہ کتابیں تو میں نے نہ جانے کتنی کتنی بار پڑھ ڈالیں ......اور میرزا ادیب کی دوسری جاذب تحریریں اس کے علاوہ تھیں......

احمد عدنان طارق کی "تزئین اور تتلیاں" جب ہمارے گھر آئی تو میری بیٹی نے اس کتاب کو اتنا پڑھا اتنا پڑھا کہ شاید وہ اب احمد عدنان طارق کو اُن سے بہتر انداز میں اُن کی وہ کہانیاں سنا سکے جو "تزئین اور تتلیاں" میں چھپی ہیں......

بتانے والی بات یہ تھی کہ جب میں نے زمانہ طالب علمی میں "صحرا نورد کے خطوط" پڑھی اور اس کے سحر میں کھو سا گیا تو میں بے ساختہ اٹھا اور چل پڑا...... ایک اخبار کے دفتر گیا اور پوچھا......

"صحرا نورد......میرزا ادیب" کہاں ملیں گے ...... وہاں موجود صحافی نے بتایا...... وہ چوہان روڈ، کرشن نگر رہتے ہیں ویسے آج عصر کے بعد شاہ محمد غوث لائبریری میں اک مشاعرہ ہے جس کی مرزا ادیب صدارت کریں گے...... میں خوفناک گرمی میں پیدل چلتا......شاہ محمد غوث لائبریری پہنچا......تین کلو میٹر کا یہ سفر میں نے پیدل طے کیا تانگوں ریڑھوں کی گرد سے اٹا جب میں لائبریری داخل ہوا تو میرے اسکول کے استاد راز کاشمیری مل گئے...... میں نے مدعا بیان کیا تو میری پریشانی دیکھ کر باہر آئے اور انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے بولے......"ابھی ابھی مشاعرہ ختم ہوا اور وہ پیدل ہی دہلی دروازہ سے کرشن نگر اپنے گھر جائیں گے۔"

تم بھی پیچھے پیچھے چل پڑو...... کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جائے گی......

میں پھر پیدل چل پڑا......راستے میں کسی نیک دل نے حضرت امام حسینؓ کی سبیل لگا رکھی تھی...... وہاں سے میں نے ٹھنڈے دودھ کے تین گلاس پیے اور بتائے راستوں پر چل نکلا...... پھر سے سات کلو میٹر پیدل چلا اور ہانپتا ہانپتا......میرزا ادیب کے گھر جا پہنچا......میرزا صاحب نے میرا حلیہ دیکھا (اُس دور میں مت پوچھئے لاہور میں کس قدر گرد اڑتی تھی) تو فوراً اندر بلا لیا...... "بیٹھک" میں بیٹھے...... میرے لیے حکیمی شربت منگوایا اور بولے......تم پیاس بجھاؤ میں ابھی شاہ محمد غوث لائبریری سے مشاعرہ کی صدارت کر کے آ رہا ہوں "شوز" اتار لوں پھر بات کرتے ہیں...... یا اللہ خیر میرزا صاحب شوز کیوں اتاریں گے......؟

گویا ہم دونوں کہیں ساتھ ساتھ ہی پیدل آ رہے تھے...... یہ تھی میرے صحرا نورد کے خطوط کے خالق سے ملاقات کی خواہش......اب جب میں بچوں کو احمد عدنان طارق کی کہانیاں ذوق و شوق سے پڑھتے دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ کسی دن کوئی حافظ مظفر محسن پیدل نکل پڑے گا اور آٹھ دس کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے جھنگ پہنچے گا اور تھانہ صدر جھنگ کے محرر سے ہانپتا ہانپتا......جا کر کہے گا......

"مجھے "تزئین اور تتلیاں" کے مصنف احمد عدنان طارق سے ملنا ہے" اور ...... محرر بچے کو اک ٹھنڈی کوکا کولا پلاتے ہوئے محبت سے کہے گا "بیٹا پچھلے ہفتے لکھاری انسپکٹر احمد عدنان طارق کی سلسلہ ملازمت جھنگ سے فیصل آباد تعیناتی ہو چکی ہے"......!!!

کالا پربت

نیلم احمد بشیر

نبیل یونیورسٹی چلا تو آیا تھا مگر بوجھل دل سے۔ نہ جانے کیوں؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا دل خوامخواہ اُداس کیوں ہو رہا ہے؟ یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ مگر کیا؟ سب کچھ ٹھیک تو تھا۔ صبح نو بجے سے کچھ قبل جب اسے زلزلے کے ایک زوردار جھٹکے نے جگایا تھا تو وہ زیادہ خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ لاہور میں ہلکے ہلکے جھٹکے تو کبھی کبھار آ ہی جاتے ہیں۔ یہ جھٹکا کچھ لمبا ضرور تھا مگر لاہور کے جی داروں کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ریشم بھی ایسے ہی کہا کرتی تھی۔ وہ کہتی "جب سے تم پڑھنے کے لیے لاہور گئے ہو کافی ڈھیٹ اور لاپروا ہو گئے ہو۔ پہلے کی طرح میرا خیال نہیں رکھتے۔ یہ لاہور والے کیا ایسے ہی بے نیاز ہوتے ہیں؟ کیا ان پہ کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟"

اس بات کے جواب میں پہلے تو وہ زور زور سے ہنستا! کھلکھلاتا پھر جھوٹ موٹ پنجابی فلم کے لاپرواقسم کے ہیرو بننے کی اداکاری کرتے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دینے لگتا۔ تو وہ بھی مذاق اُڑاتے ہنسنے لگ جاتی اور وہ مسرور ہو کر اسے دیکھنے لگتا۔ اس کی ہنسی دیکھ کر لگتا جیسے وادی کی بہتی ندیوں سے اچانک کوئی نیا چشمہ پھوٹ نکلا ہو۔ ایسا چشمہ جس میں خوابوں کی چاندی گھلی ہوئی ہو اور پانی کی جگہ موتی بہتے ہوں۔ مچھلیوں کی جگہ جل پریاں رہتی ہوں۔

کلاس سے آ کر نبیل نے خبریں دیکھنے کے لیے ٹی لگا لیا۔ خبریں ایسی تھیں کہ دیکھ کر اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ صبح کو معمولی سا محسوس ہونے والا زلزلہ ملک میں شمالی علاقہ جات میں اتنی بڑی آفت بن کر نازل ہوا تھا اور اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔

"یا میرے خدا" اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور جلدی جلدی گھر فون ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ کسی کا بھی فون مل نہیں رہا تھا۔ امی ابو، بہن بھائی، چچا کا خاندان اور پھر ریشم، کوئی بھی اپنا فون نہیں اُٹھا رہا تھا۔ آخر سب کہاں چلے گئے تھے؟ نبیل کو پریشانی ہونے لگی۔ ٹی وی پہ خبریں سن سن کر اسے ڈر لگنے لگا۔ نیوز کاسٹر بتائے چلے جا رہے تھے کہ بالاکوٹ، مظفرآباد اور ملحقہ علاقوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا اور شدید جانی نقصان کا بھی اندیشہ تھا۔ نبیل کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ زلزلے کے وقت تو ریشم اپنے سکول پڑھانے کے لیے جا چکی ہوگی۔

نبیل اسلام آباد جانے والی بس میں بیٹھا اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اپنے ہونٹ مسلسل کاٹتا چلا جا رہا تھا اور کسی کا خوبصورت چہرہ پورے چاند کی طرح اس کے خیالوں میں دمک رہا تھا۔ ریشم اور وہ چچا زاد اور بچپن سے ایک دوسرے کی منگ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین دوست بھی تھے۔ دونوں نے مستقبل کے حوالے سے خوبصورت خواب دیکھ رکھے تھے جن کے پورے ہونے کا وقت اب زیادہ دور نہیں تھا۔

بچپن میں وہ دونوں ہم جولیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے پہاڑوں اور وادیوں میں دور نکل جاتے۔ کھیل میں بہت مزا آتا کیونکہ چھپنے کے لیے جگہیں بہت تھیں اور وادی کی گود بہت وسیع تھی۔ نبیل اکثر اوقات سب سے پہلے ہی دوستوں کو ڈھونڈ نکالتا اور جیت جاتا۔ دوست حیران ہو ہو جاتے کہ وہ انھیں اتنی مشکل جگہوں سے کیسے ڈھونڈ لیتا تھا۔ وہ ہنستا اور سب ہارنے والوں کو خوب چھیڑتا۔ وہ ڈھونڈ نکالنے میں اتنا ماہر تھا کہ قدموں کی چاپ، پتوں کی سرسراہٹ اور ہوا کی سرگوشیوں سے ہی کھوج نکال لیتا اس کے ساتھی کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ اس کی شو بن جاتی تو وہ سینہ پھلا کر کہتا "دراصل میرے قبضے میں کوہ کاف کی ایک پری ہے۔ ایک بار وہ مجھے ایک پہاڑی پر بیٹھی روتی ہوئی ملی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا تو کہنے لگی "میں گھر سے نکلی تھی سودا سلف لینے پھر واپسی کا راستہ بھول گئی۔ کاش مجھے کوئی پرستان پہنچا دے۔ میں نے اسے تسلی دی اور پھر اس کی مدد کی تو وہ ہنسی خوشی اپنے گھر جا پہنچی۔ انعام کے طور پر اس نے مجھے یہ دو سپر کان دیے۔"

"سپر کان؟" ریشم اور ساتھی دوست حیرانگی سے پوچھتے۔

"ہاں بھی، جیسے سوپر مین کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو اتنی آسانی سے تم سب کی باتیں، سرگوشیاں سن لیتا ہوں۔" وہ منہ بنا بنا کر بولتا جاتا اور ریشم اس کے کان مروڑ کر انھیں گھما گھما کر ٹیسٹ کرنے لگتی۔

وہ بس میں بار بار فون ملائے جا رہا تھا کہ اچانک نہ جانے کیسے اس کے بھائی صغیر نے اپنا فون اُٹھا لیا۔

"صغیر! شکر ہے خدا کا تم نے فون تو اُٹھایا۔ کہاں ہو تم؟ سب لوگ خیریت سے تو ہیں نا؟" نبیل نے بے صبری سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔

"کوئی بھی خیریت سے نہیں ہے بھائی جان۔ سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا ہے۔ کچھ نہیں بچا۔" صغیر نے

بچکیوں کے درمیان تیز تیز انداز میں جواب دیا۔

"میں تو اتفاقاً باہر گیا ہوا تھا ساتھ والے گاؤں اس لیے میری بچت ہو گئی ورنہ....."

صغیر نے بات ادھوری چھوڑ دی اور خود سسکیاں لینے لگا۔ نبیل کو لگا اس کے کلیجے میں جیسے کسی نے خنجر گھونپ دیا ہو۔

"اور ریشم!" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"سب سکولوں کی چھتیں گر چکی ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ان کا۔" شکیل نے بچکیوں کے درمیان جواب دیا اور پھر فون کٹ گیا۔ شکیل کو ایسا لگا جیسے وہ کسی پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے لیے بڑی احتیاط سے قدم جماتا اوپر کو جا رہا ہو اور رسی یک دم ہاتھ سے چھوٹ گئی ہو۔ وہ پاتال میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا تھا۔

کیا وہ اب کبھی ریشم کو، اپنی زندگی کو دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا؟" اس سوال نے اس کے ذہن میں دھماکے کرنے شروع کر دیے اور آنسو اس کی آنکھوں سے بے اختیار بہنے لگے۔

"اے خدا مہربانی کر۔ اے میرے رب! میرے عزیزوں، میرے پیاروں کی خیر ہو۔" اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔

نبیل جب بسیں بدلتا جاگتا سوتا، منزلیں طے کرتا بالاکوٹ پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ اس کے گھر جانے کا کوئی بھی راستہ سلامت نہ رہا تھا۔ مددگار ٹیموں کے دستوں نے خیمے گاڑھ لیے تھے اور ان میں روشنیاں جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ ان کا گھر کہاں تھا؟ دوسروں کے گھر کہاں تھے؟ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ یہ تو ٹوٹی ہوئی، گری ہوئی عمارتوں، دل چیر دینے والے سناٹوں کا شہر تھا اور بس۔ ہر طرف ملبے کے تودے، بیچ جانے والوں کے پریشان چہرے اور خوفزدہ آنکھیں تھیں جو وقفے وقفے سے آنے والے بعد کے جھٹکوں سے سہم کر مزید سہم جاتی تھیں۔ بھائی اسے اپنے ماں باپ کے گھر کے آگے بت بنا کھڑا مل گیا۔ نبیل کو دیکھتے ہی وہ رو دیا اور اس کے ساتھ مل کر ملبہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اینٹ، سیمنٹ، سریا، انسانوں کے نرم و نازک گوشت پوست سے بنے زندہ جسموں کو زندگی کی قید سے آزاد کر چکا تھا۔ دونوں بت بن کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

کیا یہ وہی گل پوش حسین وادی تھی جہاں زندگی ایک شہزادی کی مانند ناچتی مسکراتی، خوش رنگ پھول چنتی، سر پہ خوشبوؤں کے تاج سجاتی بادلی ندیا کی طرح ہر دم اٹھلاتی نظر آتی تھی؟ شریر جھرنے ہنستے گاتے دور نکل جایا کرتے تھے اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی تھی؟ پھر کیا ہوا کہ شہزادی کا راج پاٹ پل بھر میں ہی الٹ گیا اور موت وادی کی رانی بن بیٹھی؟ کالا چوغہ پہنے بد ہیئت موت اپنے کارندوں کو حکم دیتی دکھائی دیتی تھی کہ سب کچھ مٹا دو روند ڈالا، مار ڈالو، ختم کر دو۔ زندگی کا ہر نشان مٹا دو، تباہ کر دو، سب کچھ برباد کر دو۔

"اے خدا ہمیں معاف کر دے۔" نبیل سسکنے لگا۔ صغیر نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینا چاہی۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟ وہ سوچتا چلا گیا۔ اسے خیال آیا، شاید ہم انسان بہت جلدی میں رہتے ہیں۔ ہر دفعہ جلدی ہی جلدی۔ سرعت ہی سرعت۔ شاید ہم سب کسی خود فریبی میں رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ بادشاہوں کی طرح طاقت کے زعم کا کلف لگائے اکڑے اکڑے پھر رہے تھے کہ اس سب سے برتر طاقت نے ہمیں ایک ہلکے سے ٹھوکے سے ہلا کر کچھ یاد کروانے کی کوشش کی ہے اور پھر ہمیں یاد آ گیا ہے کہ ہمارا کوئی خالق و مالک بھی ہے۔ جس کے قبضے میں سب کچھ ہے۔ جان و مال، زمین و آسمان، پوری کائنات۔

اس نے ہمیں یاد دلایا کہ ہمارا ایک خدا بھی ہے جسے ہم اکثر کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ اسی کی ڈانٹ تھی، اسی کی یاددہانی تھی کہ "میں ہی ہوں فنا اور بقا۔ میں ہی ہوں سب سے بڑی حقیقت۔ باقی سب کچھ مایا ہے۔"

پھر اس کے حکم سے بستیاں اجڑ گئیں۔ راستے بند ہو گئے، خوشبوؤں کے سانس گھٹ گئے اور ہمیں وہ یاد آیا جو اول و آخر ہے۔ ہمارا سب سے اہم رشتہ دار ہے۔

نبیل کے دل میں ہوک سی اٹھی اور وہ دیوانہ وار ریشم کے سکول کی جانب بھاگنے لگا جو وہاں سے اتنا دور نہیں تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ عمارت کے در و دیوار منہدم ہو چکے تھے اور چاروں طرف ملبے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سکول کہاں وہاں اب ویرانی اور وحشت تھی، خوف اور دہشت تھی اور کچھ بھی نہیں تھا۔

"تم کیا لینے آئے ہو یہاں؟ کچھ بھی تو نہیں بچا؟" جڑ سے اکھڑے ایک اداس درخت نے اس سے سرگوشی کی۔ نبیل نے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور زمین سے باہر نکلی ہوئی جڑوں کو پیار سے چھونے لگا۔ ریشم اس وقت کہاں ہوگی؟ اس نے کرب سے سوچا۔ درخت کی جڑوں کو چھو کر اسے لگا جیسے اس نے ریشم کے آنچل کو چھو لیا ہو۔ "ریشم ریشم" وہ منہ ہی منہ میں اس کا نام جاپنے لگا۔ کچھ زخمی مائیں اور باپ اپنے بچوں کو ملبے سے ڈھونڈ نکالنے کے لیے آوازیں دے رہے تھے۔ زور زور سے پکار رہے تھے۔ کس قدر وزنی ملبے کے نیچے دبے ہوئے تھے وہ نازک پھول

سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ وہیں سیمنٹ کی ایک سل کے اوپر لیٹ گیا مگر پھر یک دم کسی خیال کے آتے ہی اچانک وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کیا پتہ اس سل کے نیچے کوئی زندہ ہو؟ کیا پتہ ریشم ہی ہو۔ میں کم از کم اپنے وجود کا بوجھ تو اس پہ نہ پھینکوں! اسے مزید مشکل میں نہ ڈالوں۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور گھاس میں لیٹ گیا جہاں سے آسمان پہ کھلے چمکدار ستاروں کی تازہ فصل صاف دکھائی دے رہی تھی۔

یہ چاند اور تارے آج اتنے روشن اور دمکتے کیوں نظر آ رہے ہیں؟ کیا انھیں خبر نہیں کہ زمین پہ قیامت آ چکی ہے؟ وقت تھم چکا ہے اور موت اپنا کالا چوغہ پہنے ہر طرف دندناتی پھر رہی ہے؟ چاند ستاروں کی چمک دمک اس وقت اسے بہت بے معنی اور بے جا محسوس ہونے لگی۔ اس نے کچھ خفا ہو کر ان سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر کے پھر سے اس ناقابل یقین سانحے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جس نے ایک ہی جھپٹے میں اس سے اس کے اتنے پیارے لوگ چھین لیے تھے۔

''سو جاؤ'' ایک ننھے معصوم ستارے نے اس سے سرگوشی کی تو وہ پوری طاقت سے چیخ اُٹھا۔ ''نہیں'' میں بھلا کیسے سو سکتا ہوں؟ مجھے چین کیسے آ سکتا ہے جبکہ میرے پیارے زمین کے اندر دبے ہوئے ہیں۔ ''ریشم...... ریشم بھی تو نیچے ہی ہو گی۔ مجھے ان کی مدد کرنا ہے۔ مجھے کچھ کرنا ہے۔'' وہ سوچتے سوچتے یک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

سکول کی عمارت آخری مغل فرمانروا کی تقدیر کی طرح سرنگوں تھی۔ ہر طرف حسرت و یاس کا سماں تھا۔ موت اپنے بال کھولے، دانت نکوسے وحشت بھری دھمالیں ڈال رہی تھی۔ سکول کے طالب علموں کے متعدد بستے، پنسلیں، ربڑ، شاپنر، کاغذ اِدھر اُدھر بکھرے نظر آ رہے تھے۔ کئی تو ٹوٹ پھوٹ چکے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جنھیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور سلامت تھے۔ ان بستوں کو ان کی ماؤں نے کتنے پیار سے صبح ان کے گلوں میں ڈالا ہوگا۔ کئی ناشتہ دان اُلٹے پڑے تھے جن میں ان کی ماؤں نے انھیں آدھی چھٹی کے وقت کھانے کو کچھ نہ کچھ دیا تھا۔ لفافوں میں بند پراٹھے، کباب، انڈے، بسکٹ، توس مکھن اور نہ جانے کیا کیا۔

چند خوفزدہ اور بھوکی بلیاں اور کتے کھانے کی خوشبو سونگھ کر ان لفافوں کی طرف بڑھتے اور اُلٹنے پلٹنے لگ گئے۔ یہ دیکھ کر نبیل کے دل میں اچانک ایک نیا اور خوفناک خیال آیا۔ کیا خبر کل کو زلزلے کے مارے ہوئے مردہ اور نیم مردہ زخمی لوگوں کو بھی یہ کتے بلے سونگھنے لگیں اور...... اور...... نہیں۔'' یہ بھیانک خیال اسے ڈرانے لگا اور اس نے اُٹھ کر پتھر اُٹھا کر کتوں بلیوں کو بھگانے کی کوشش میں اُلٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیے۔

ایک شاپر بیگ سے جھانکتا ہوا ناشتہ دیکھ کر وہ خود کو ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے سے باز نہ رہ سکا۔ بستے پہ بچے کا نام ''عبدالقیوم'' لکھا ہوا تھا جسے پڑھتے ہی اس کے کلیجے میں پھانس سی چبھی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ عبدالقیوم کی ماں نے لنچ ٹائم کے لیے اپنے پیارے لاڈلے بیٹے کو کھانے کے لیے پراٹھے، انڈے کے ساتھ ساتھ آم کے مربے سے ایک میٹھی قاش بھی دی تھی جس میں سے الائچی کی میٹھی میٹھی اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ نبیل کو اسی لمحے اپنی امی کے ہاتھ کے بنے ہوئے پراٹھے یاد آ گئے۔ اسے لگا جیسے وہ اس وقت نبیل نہیں چوتھی جماعت میں پڑھنے والا چھوٹا سا عبدالقیوم ہو اور یہ ناشتہ اس کی اپنی ماں نے اس کے لیے بھیجا ہو۔ اسے یک دم اپنے معدے میں گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی تو یاد آیا کہ اس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ مائیں کتنی اچھی اور کتنی بڑی نعمت ہوتی ہیں۔ عبدالقیوم کے حصے کا مزے دار پراٹھا اور انڈہ کھاتے ہوئے اسے یہی خیال آ رہا تھا۔ بڑے زلزلے کے بعد بھی جھٹکے آتے جا رہے تھے۔ وہ گھبرا کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد غور سے اِدھر اُدھر دیکھتا اور ساکت ہو کر پوری توجہ سے ملبے کی طرف نظر دوڑاتا کہ کیا پتہ زمین کہیں سے دوبارہ شق ہو گئی ہو اور ریشم باہر نکل آئی ہو۔

کھانے کے بعد وہ دوبارہ گھاس پہ لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک اسے لگا جیسے زمین میں سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آوازیں آ رہی ہوں۔ اس نے کچھ دیر تک انھیں سنا اور پھر یقین کر لینے کے بعد اپنے کان دوبارہ ملبے پہ لگا دیے اور غور سے سننے لگا۔ یہ کیا؟ اس نے حیرانی سے سوچا۔ آوازیں واقعی زمین کے نیچے سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو بچے آپس میں بات کر رہے ہوں۔ نہ جانے زمین کی کس تہہ میں چھپے ہوئے تھے وہ؟''

''کون ہے؟ کون بول رہا ہے؟'' نبیل پوری طاقت سے چیخا لیکن شاید اُوپر سے آواز نیچے کو نہیں جا رہی تھی۔ کیونکہ اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ خاموشی یونہی چھائی رہی۔ ''کہیں یہ میرا وہم نہ ہو۔''

اس نے اپنے کان زمین پر ہی لگا دیے۔ کیا واقعی کوئی زندہ تھا؟ کیا خبر اب بھی کچھ لوگ نیچے دبے سانس لے رہے ہوں؟ اس کا تو مطلب ہے شاید ریشم بھی......'' اس اُمید نے اس کے وجود میں دیے سے

روشن کر دیے اور وہ ریسکیو ورکرز کی تلاش میں سرپٹ بھاگنے لگا۔ شہر میں کدالیں کم تھیں اور کھدائی کا کام بہت زیادہ۔ ابھی تک بہت زیادہ امدادی ٹیمیں وہاں پہنچ بھی نہ سکی تھیں اس لیے نبیل کے بے حد اصرار اور منت و سماجت کرنے کے باوجود اسے مدد حاصل کرنے میں زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ یہ مشکل کھدائی ہاتھوں سے نہیں بلکہ مشینوں، کرینوں سے ہونے والی تھی اور ایسی کسی چیز کا وہاں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ بعد میں ٹی وی پہ خبریں دیکھنے کے بعد علم ہوا کہ ہیوی ڈیوٹی کرینیں اور امدادی مشینیں تو حکمرانوں کے شہر میں گر جانے والی ایک کروڑ پتیوں کی رہائشی بلڈنگ کا ملبہ اُٹھانے کا کام کر رہی تھیں۔ وہ بھلا چھوٹے گاؤں اور گراؤں میں کیسے بھجوائی جاسکتی تھیں۔

دو دن کی مستقل محنت، منت سماجت، اصرار کے بعد نبیل کے کہنے پر امدادی کارکنوں نے واقعی دو بچوں کو نیم مردہ حالت میں ملبے کی قبر سے باہر نکال لیا۔ فرطِ مسرت سے نبیل کے آنسو تھمتے نہ تھے۔ اس روز کے بعد سے نبیل نے فیصلہ کرلیا کہ وہ حوصلہ نہیں ہارے گا۔ وہ ہر رات خاموشی سے ملبے کی ڈھیریوں پر کان لگا دیتا اور آوازیں سننے کی کوشش کرتا۔ جہاں سے بھی اسے کسی سرسراہٹ، کسی سرگوشی کا گمان ہوتا وہ وہاں چاک سے نشان لگا دیتا اور صبح ہوتے ہی ورکرز کو مجبور کرتا کہ وہ وہاں کھدائی کریں۔ بڑی مشکلوں سے وہ اس کی بات مانتے۔ کبھی کبھار تو وہاں سے کچھ بھی نہ نکلتا اور کبھی کبھار کوئی ایک آدھ بچے کھچے سانسوں والا بچہ واقعی نکل آتا تو سب خوش ہو جاتے۔ ٹی وی والے رپورٹروں نے اسے ''سرگوشیاں سننے والا'' شخص قرار دے کر اس کے بارے میں ایک دلچسپ سی سٹوری بھی تیار کر لی تھی جسے وہ بار بار ٹی وی پر دکھا کر لوگوں کو حیران کر رہے تھے۔ کئی اخبار والے اس سے انٹرویو لینے کے لیے اس سے ملنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر نبیل کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ اسے کسی طرح سے ریشم کا پتہ مل جائے، کسی طرح وہ ریشم تک پہنچ سکے اور بس اُسے ڈھنگ سے سوئے ہوئے تقریباً چار راتیں ہو چکی تھیں۔ نیند کے جھونکے آتے تو وہ ان سے لڑتا چند ہی لمحوں بعد بیدار ہو کر اُٹھ بیٹھتا۔

وادی میں انسانوں اور جانوروں کی لاشوں کا تعفن پھیل چکا تھا مگر نبیل وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

''اتنے دن ہو گئے بھائی جان، اب ہمیں اُمید نہیں رکھنا چاہیے۔'' ایک روز اس کے چھوٹے بھائی صغیر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر نبیل کی خاموشی نے اسے بتا دیا کہ نبیل ابھی حوصلہ ہارنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے اب بھی کسی معجزے کی توقع اور کسی ان ہونی کا انتظار تھا۔

''اگر ایک فیصد بھی کسی کے زندہ بچ جانے کے چانس ہوں تو ہمیں انھیں یہ چانس تو دینا چاہیے نا۔ میں ریشم کو ڈھونڈ کر ہی رہوں گا صغیر۔'' اس نے متوحش آنکھوں سے بھائی کو دیکھا تو وہ چپ ہو گیا اور بھائی کی ذہنی صحت اور دل کے سکون کے لیے دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا۔

وہ زلزلے کا پانچواں روز تھا۔ دوپہر شام میں ڈھل رہی تھی جب سکول کے ملبے پہ بے سبب، بے مقصد گھومتے پھرتے، پل بھر کو رُکتے، سانس لیتے، چلتے ہوئے نبیل تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ صبح سے اس نے کسی کو کوئی آہ، ہچکی، پکار کچھ بھی نہ سنا تھا۔ بس ایک اس کے اپنے دل کی دھڑکن تھی جس کی آواز سے پوری وادی گونج رہی تھی۔ اسے ریشم بے طرح یاد آ رہی تھی۔ ''کاش پریوں کی کہانیوں کی طرح زمین کے کسی کونے کھدرے سے ریشم کی اوڑھنی کا کوئی حصہ ہی دکھائی دے جائے۔ کوہ قاف کی وادی کی ایک خوبصورت پری راستہ بھول کر کہیں پاتال میں جا چھپی تھی اور وہ اس کی مدد کرنے کو بے چین تھا۔ اسے راستہ دکھانا چاہتا تھا مگر شاید وہ کہیں بہت دور چلی گئی تھی جو ابھی تک اسے اس کا کوئی سراغ ہی نہیں مل رہا تھا۔ ریشم تو اس وادی کی بیٹی تھی تو شاید دھرتی ماں اسے پرسکون نیند دینے کے لیے اپنی آغوش میں لوریاں دے رہی تھی۔ شاید شاید...... نہیں نہیں۔

اس نے اس خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا اور عمارت کے ملبے کے اردگرد دیوانہ وار چکر لگانے شروع کر دیے اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

ملبے کو کھنگالتے پھرولتے اس کے ہاتھوں میں کلاس روم کے باہر لگی ہوئی ایک تختی آ گئی جس پر جماعت چہارم بی لکھا صاف نظر آ رہا تھا۔ ''یا خدا! نبیل کا سر گھوم گیا۔ یہ تو ریشم کا کلاس روم تھا۔ اس نے فوراً گھٹنوں کے بل جھک کر ملبے کی کئی تہوں کا بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی وہ اُٹھتا، کبھی بیٹھتا تو کبھی لیٹ جاتا۔ ''ریشم ریشم'' اس نے اپنے گلے کی پوری طاقت سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ اچانک اُسے لگا جیسے جواباً کہیں دور سے، کسی نیچی جگہ سے جیسے ہلکی سے تھپتھپاہٹ کی آواز آ رہی ہو۔ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں۔'' اس نے زور زور سے اپنے اردگرد پڑی لوہے کی چیزوں کو سیمنٹ کی سلوں پر مارنا شروع کر دیا اور پھر جواب سننے کے لیے کان زمین سے لگا دیے۔ جواب میں واقعی ہلکی سی آواز آ رہی تھی جو ہوا کی سرگوشی سے زیادہ محسوس نہ ہوتی تھی۔ نبیل دیوانوں کی طرح زمین کھودنے لگا۔ اس کے ناخن زخمی ہو رہے تھے۔

کہنیاں چھل رہی تھیں مگر اس پہ تو جیسے کوئی جنون سوار تھا۔ ریشم زندہ تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ رواں رواں پکار رہا تھا۔ اسے زمین کھودتے دیکھ کچھ اور لوگ بھی اپنے پھاوڑے اُٹھائے اس کی مدد کو آگئے اور گھنٹے بھر کی جان توڑ کوششوں کے بعد ایک نوجوان لڑکی اور ایک بچے کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ نبیل کو خدا پہ بے اختیار پیار آگیا اور وہ زمین پہ جھک کر سجدے دینے لگا۔ ریشم اور بچہ نیم مردہ مرجھائے ہوئے پھولوں، ٹوٹی پھوٹی ڈالیوں کی طرح سٹریچروں پہ ڈال کر فوراً ہسپتال لے جائے گئے اور ٹی وی والوں نے ایک بار پھر نبیل کے بارے میں نئی رپورٹ تیار کرنا شروع کر دی کہ کیسے ایک شخص نے نہ زمین سے آوازیں بلکہ سرگوشیاں سن کر قیمتی جانیں بچالی ہیں۔

"ریشم! میری جان...... میری زندگی میں جانتا تھا تم مجھے اکیلا چھوڑ کر کبھی نہیں جاسکتیں۔ میری دنیا میں واپس لوٹ آنے کا شکریہ۔" اس نے کئی دن ملبے کے نیچے دبی رہنے والی اپنی خوبصورت سچی محبت کے کانوں میں سرگوشیاں کر کے رس انڈیلا اور اس کا زخمی ہاتھ دھیرے سے چھو کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جواب میں ریشم نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر مسکرا کر دھیرے سے بند کر لیں۔ ایک عجیب سا اطمینان تھا ان آنکھوں میں۔ نبیل کا خون سیروں کے حساب سے بڑھ گیا۔ اسے اپنی خوش بختی پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ ماں باپ بہن بھائیوں کے بعد اب صغیر اور ریشم ہی اس کی کل کائنات تھے۔ اس لیے وہ دل و جان سے ان کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ کئی زخمیوں کی طرح ریشم کو بھی اسلام آباد کے ایک بڑے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں اس کی دن رات نگہداشت ہونے لگی۔ ہسپتال میں کمرے کم تھے اور مریض زیادہ اس لیے بہت سے زخمیوں کو برآمدوں اور گھاس کے قطعوں پر ہی لٹانا پڑ رہا تھا مگر ایسے وقت میں تو زندہ بچ جانا ہی بہت تھا۔ ہر طرف نفسا نفسی اور افراتفری کا عالم تھا۔ ہر کوئی اپنے کھوئے ہوئے رشتہ داروں کی آس میں دروازوں کی طرف دیکھتا تھا اور جلد سے جلد ٹھیک ہو کر وہاں سے رُخصت ہو جانا چاہتا تھا مگر اب تو واپس جانے کے لیے ان کے پاس گھر بھی نہیں تھے نہ جانے کہاں جانا تھا ان کو؟ انھیں کچھ پتہ نہیں تھا۔

ریشم کے جسم پر چوٹیں تو بہت آئی تھیں مگر شکر تھا کہ ہڈیاں نہیں ٹوٹی تھیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ پندرہ بیس دنوں میں وہ ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر جا سکتی تھی۔ گھر اسے بھی پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ نبیل نے ابھی اس بارے میں کچھ سوچا نہ تھا۔ سوچا تھا تو بس یہی کہ ریشم کیسے جلد اچھی ہو جائے۔ اسے مزید کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اسے سکون ملے۔ آرام نصیب اور وہ ہمیشہ چین سے رہے۔

رات بھر وہ مریضوں کے کراہنے کی آوازیں سنتا۔ اپنے پیارے ماں باپ، بہن بھائی کا تصور اسے ستانے لگتا تو نیند اس سے بہت دور کہیں دور چلی جاتی۔ وہ جلتی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سکون پانے کی کوشش کرتا مگر اسے کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ ریشم کی ہلکی سی "سی" اور "اُف" پر لپک کر اس کے کمرے میں جا پہنچتا اور اسے دیکھ کر تسلی کر لینے کے بعد باہر آ کر پھر سے لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے میں معروف ہو جاتا۔ دن میں بھی نبیل اس کے قریب ہی منڈلاتا رہتا۔ کبھی اسے اس کی پسند کا برگر اور بوتل لا دیتا تو کبھی چاکلیٹوں کے پیکٹ اور پھول اس کا بالکل بچوں کی طرح خیال رکھتا۔ اس کی اتنی توجہ اور محنت کی وجہ سے ریشم ذہنی طور پر توانا محسوس کرنے لگی تھی اور اس کی جسمانی صحت بھی روز بہ روز بہتر ہوتی جا رہی تھی۔

"اب میں بہت بہتر ہوں نبیل۔ تم رات کو ہوسٹل میں جا کر آرام سے سو لیا کرو۔ خوامخواہ یہاں بے آرام ہوتے ہو۔" ایک رات ریشم نے اسے پیار سے کمرے سے باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"میں تمھیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں ریشم۔ اب ہم دونوں کا اس دنیا میں ایک دوسرے کے بغیر آخر ہے ہی کون؟" نبیل نے اسے ہولے سے تھپک کر تسلی دی۔

"تمھارا نیند سے برا حال ہو جاتا ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پہلے بھی تم کتنا کچھ برداشت کر چکے ہو۔ پلیز جا کر سو جاؤ۔ تمھیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔"

"تم سے دور جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا کروں؟" نبیل مسخری کرتے ہوئے اُلٹے سیدھے منہ بنانے لگا۔

"دیکھو یہاں ہسپتال میں اتنے لوگ ہیں میرا خیال رکھنے والے۔ ڈاکٹرز، نرسیں، سوشل ورکرز، والنٹیئرز، پھر تمھیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں بھی اب سونا چاہتی ہوں۔ اوکے گڈ نائٹ۔" ریشم نے مسکرا کر اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کیا تو وہ بادل ناخواستہ اُٹھا اور اس کا ماتھا چوم کر باہر کو چلا آیا جہاں اس کا زمینی بستر حسب معمول اس کا منتظر تھا۔ آج واقعی اسے بہت زور کی نیند آ رہی تھی۔ تکیہ پہ سر رکھتے ہی وہ بے خبر ہو کر سو گیا اور ہسپتال کے کاریڈور میں جلنے والی بتیاں سٹاف نے قدرے دھیمی کر دیں۔

گہری نیند میں ڈوبی ریشم کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس کے زخمی بدن میں درد سا اُٹھ رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کوئی اس کے بالکل قریب کھڑا

اس کے بدن کو ٹٹول رہا تھا۔ "یہ کیا؟" وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پیچھے کو ہٹی، اتنی پیچھے کہ اسے لگا وہ بستر سے نیچے ہی گر جائے گی مگر کسی نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایک انجانے سے خوف سے ریشم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے چیخنا چاہا مگر آواز اس کے گلے میں جیسے گھٹ سی گئی، باہر نہ آئی۔ کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ شاید بجلی چلی گئی تھی۔ گہرے اندھیرے کے باوجود ریشم نے ڈاکٹر احسن کو اس کی بڑی بڑی مونچھوں کی چبھن اور کلون کی مخصوص مہک کی وجہ سے پہچان لیا۔ زخم لگانے والا یہ مسیحا تو دن میں کئی بار اسے وحشت بھری تعریفی نظروں سے گھور کر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا حال چال پوچھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ ریشم سے یہ سوال کرتی نظر آئیں "اے خوبصورت پری تو ہسپتال کے اس بے رنگ دکھ بھرے وارڈ میں کیسے؟ تجھے تو کسی عالی شان محل کے مخملیں بستر پہ ہونا چاہیے تھا۔" ریشم کی قوت مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ شاید یہ اس ٹیکے کا بھی نتیجہ تھا جو خوفناک جن نے اس کے بازو میں اچانک ٹھونک کر اسے بے بس سا کر دیا تھا۔

"نبیل! ہیلپ، ہیلپ، بچاؤ۔" ریشم کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں۔ "بچاؤ نبیل" اس کے لبوں پہ سسکی سی اُبھری اور پھر اس نے چند ہی لمحوں میں اس کے بول پہ ہی دم توڑ دیا۔

ریشم کو ہوش آئی تو صبح کا اُجالا کمرے میں پھیل چکا تھا۔ نرس سفید براق لباس میں اس کے پاس کھڑی اس کا بلڈ پریشر لینے کی کوشش کر رہی تھی اور نبیل ناشتہ کے لیے چائے کا گرم کپ ہاتھ میں تھامے دو سنکے ہوئے سلاس اور مکھن جیم کی چھوٹی سی طشت لیے اس کے قریب کھڑا پیار سے اس کو تکے جا رہا تھا۔

"آج بہت سوئیں تم؟" نبیل نے خوش دلی سے کہا۔

"رات تم کہیں چلے گئے تھے نبیل۔ میں اتنا چیخی، تم اندر کیوں نہیں آئے؟" ریشم نبیل پر برسنے لگی۔

"اوہو بھئی۔ ٹیک اٹ ایزی یار، اتنا غصہ کیوں؟ بارہ بجے تک تو میں تمہارے پاس ہی تھا یاد نہیں؟ پھر جب لائٹ چلی گئی تو میں باہر آ گیا۔" نبیل نے چائے کا گرم گرم مگ کے آگے کر دیا۔

"اندھیرے سے ڈر گئی ہوں گی۔ ویسے بھی اتنے بڑے زلزلے سے گزری ہیں نارمل ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا نا۔" نرس نے نبیل کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کہا اور خود اپنا سامان اُٹھا کر دوسرے مریضوں کی طرف چل دی۔

"آہستہ آہستہ سب ڈر دور ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔" نبیل نرمی سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

"مگر تم میری چیخیں سن کر اندر کیوں نہیں آئے نبیل؟ تم تو پتھروں سے، سیمنٹ کی سلوں سے میری سرگوشیاں بھی سن لیتے تھے۔ تم نے میری آوازیں نہیں سنیں کیا؟"

"This is not fair"

ریشم مٹھیاں بھینچ کر زور زور سے پلنگ کی آہنی اطراف پہ مارنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے دورہ سا پڑ گیا۔ وہ دیوانگی سے اپنے بال نوچنے لگی اور آگے بڑھ کر نبیل کا گریبان پکڑ لیا۔

"سوری یار! مجھے کیا پتہ تھا تم اتنا ڈر جاؤ گی لیکن تم ہی نے تو مجھے کل رات دھکے دے کر سونے کے لیے بھیجا تھا۔ تو بس میں سو گیا غلطی ہو گئی جان...... اب کبھی نہیں سوؤں گا۔" اس نے لاڈ سے اپنے کان پکڑ لیے اور مسخری کرنے لگا۔

ریشم کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا جو اس نے فوراً ہی پونچھ ڈالا۔

"تمہیں سب کچھ یاد آ گیا ہوگا نا...... آئی انڈرسٹینڈ۔" نبیل سنجیدہ ہو گیا۔

"ہاں...... زلزلہ......" ریشم آہستہ سے بولی۔

"زلزلہ آیا تھا"

اچھا چھوڑو یہ اُداس باتیں اور اب اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور ہم اپنے گھر چلیں...... میں نے کچھ پلاننگ کی ہے۔" نبیل نے محبت سے اس کے منہ میں ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا ڈالتے ہوئے کہا۔ ریشم کے دل میں پھانس سی چبھی۔

"گھر؟" پری نے حیرت سے نظریں اُٹھا کر دیکھا اور لمحہ بھر کے لیے کھو سی گئی۔ اسے لگا اس کی روح جیسے اچانک بہت میلی ہو گئی ہو۔ وہ ساری دنیا میں تنہا رہ جانے والا واحد انسان ہو۔

پری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پرستان جانے والی سڑک کو دیکھا۔ گھر کتنا دور اور اس تک پہنچنا کتنا مشکل تھا۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ بھول بھلیوں کا ایک وسیع جنگل اس کے سامنے بچھا تھا۔ دشوار گزار راستوں میں گہری کھائیاں اور اندھی گھاٹیاں تھیں۔ ایک متعفن دلدل میں اس کے ٹوٹے ہوئے پر گرے ہوئے تھے جن میں جیسے کانچ کے ٹکڑوں سے اس کا سرخ لہو قطرہ قطرہ رس رہا تھا اور ایک بہت بڑا پر ہیبت کالا پربت راستہ روکے کھڑا تھا۔

جنازے کا اعلان بعد میں ہوگا

ناصر معروف/مقط

جمال کے ضعیف چہرے پر خوف کی زردی جمی ہوئی تھی، آنکھوں کی پتلیاں شرمندگی کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں، کوئی با آواز بلند فرعونیت کے لہجے میں بولا چاچا جمال آپ اس معاملے میں مت آئیں یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا اب کے بار میں آپ کا لحاظ نہیں کروں گا یہ پیسے کا معاملہ ہے میں آپ کی وجہ سے ہر بار نقصان نہیں اٹھا سکتا آپ جانتے ہیں یہ آپ کا بیٹا ٹھگ ہے جو گاؤں کے شریف لوگوں کو کسی نہ کسی حیلے بہانے سے ٹھگ لیتا ہے، سارا گاؤں آپ کی عزت کرتا ہے لیکن اب بات بہت بڑھ چکی ہے اس نے شریف لوگوں کو ٹھگنا پیشہ بنا لیا ہے اس نے ایک مہینے پہلے مجھ سے جانوروں کا سودا کیا تھا اور کہا تھا کہ میں تین دن بعد منڈی سے پیسے لوٹا دوں گا لیکن یہ مسلسل لیت ولعل سے کام لے رہا ہے۔ اتنے میں پاس کھڑی ہوئی ایک بوڑھی عورت بولی یہ مجھ سے زیور لے گیا تھا کہ میں زیور کو پالش کروا دوں گا لیکن تین مہینے ہو گئے ہیں اس نے مجھے زیور لا کر نہیں دیا، اب کہتا ہے کہ زیور مجھ سے گم ہو گیا ہے اب میں تمہیں نیا بنوا دوں گا مجھے تو لگتا ہے کہ یہ زیور جوائے میں ہار گیا ہوگا۔ پہلا شخص بولا جس نے ثانی کا گریبان اپنے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اس گاؤں میں کونسا شخص ہے جس کی جیب ثانی نے نہیں کاٹی کون ہے جو اس کے شر سے محفوظ رہا ہے۔ یہ معاملہ اب تھانے میں جائے گا میں تھانے دار کو ساری بات بتا آیا ہوں

....

جمال گھر پہنچا تو اس کے حواس پوری طرح معطل تھے، چہرے تفکر کے آثار دیکھ کر جمال کی بیوی سمجھ گئی تھی کہ آج پھر ثانی نے کوئی گل کھلایا ہے، زیر لب جمال کی بیوی نے اسم پاک کا ورد شروع کر دیا تھا اسے یقین تھا کہ یہ ورد مجھے پریشانی اور ندامت سے بچالے گا۔ جمال کی بیوی نے آخر حوصلہ کیا اور پوچھا" کیا بات ہے آج آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں"

جمال کچھ دیر خاموش رہا اور پھر گہرے دکھ کا احساس لیے بولا" ثانی نے آج پھر میری بھرے گاؤں میں ناک کٹوائی ہے سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں، ثانی کا نام سن کر جمال کی بیوی کو حوصلہ نہیں ہوا کہ وہ پوچھتی کہ ثانی نے کیا کیا ثانی کی شکایت آنا اب معمول بن چکا تھا اس لیے اس کو اندازا تھا کہ ثانی نے کیا کیا ہوگا، ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور ماں کمرے میں ایک طرف بیٹھ کر گہری سوچوں میں غرق ہو گئی، کمرے میں گہری خاموشی تھی دونوں میاں بیوی شاید ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ جب ثانی پیدا ہوا تھا اس کے پیدا ہونے پر کتنی خوشیاں منائی گئیں تھیں، دور دور سے عزیز مبارک باد دینے آئے تھے، بڑی منتوں اور مرادوں سے جو پیدا ہوا ہوتا۔ لیکن آج وہ جمال دین کی عزت داؤ پر لگانے پر تلا ہوا تھا۔ آج چوہدری جمال کو یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ دولت سے زمین خریدی جا سکتی ہے لیکن نصیب نہیں خریدا جا سکتا، ثانی کو زندگی کی ہر آسائش میسر تھی لیکن ثانی کے جسم اور روح میں شر نے اپنا جال بنا ہوا تھا ثانی اس جال میں ایسا جکڑا ہوا تھا جیسے کوئی نحیف مکھی کسی غار میں بنے بوڑھی مکڑی کے جال میں الجھ گئی ہو، جو آزاد ہونے کی لاکھ جتن کر کے بالآخر اس جالے کے قبر میں دفن ہو گئی ہو۔

....

جمال بڑی بے چینی کے عالم میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کی بدن بولی بتا رہی تھی کہ وہ ثانی کے معاملے میں کسی منطقی انجام تک پہنچنا چاہتا ہے لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا جوان اولاد اس منہ زور گھوڑے کی طرح ہوتی ہے جو اپنے سوار کو زمین پر پٹخ کر دھول اڑاتا ہوا نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی رقم پر دست و گریبان ہونا، قسمیں قرآن اٹھانا اس کا معمول بن چکا تھا اب جمال کی چھٹی حس میں ایک خو ف جنم لے رہا تھا، اس خوف کا ذکر ابھی اس نے اپنی بیوی سے نہیں کیا تھا، اور شاید کرنا بھی نہیں چاہتا تھا، لیکن یہ خوف اس کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا، یہ خوف اس کو اپنے گرد کسی آکاس بیل کی طرح لپیٹ چکا تھا۔ وہ خدا کی بے آواز لاٹھی سے خوف زدہ تھا وہ جانتا تھا کہ ثانی جھوٹی قسمیں کھانا اور جھوٹے حلف دینا اس کا لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے وہ دنیا و آخرت سے بے خوف زندگی کے دن گزر رہا تھا وہ بھول چکا تھا کہ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو خدا کی لاٹھی حرکت میں آتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی کی ضرب سے بڑے بڑے تلملا اٹھتے ہیں ثانی کیا چیز ہے لیکن وہ ایک باپ تھا اور وہ ایک باپ کی حیثیت سے سوچ رہا تھا اس کا دل ایک کرب مسلسل کا شکار تھا، صبح سے شام ہوتی، اور شام سے صبح ہوتی لیکن جمال کو کسی لمحے بھی چین میسر نہیں آتے، آنکھوں سے اپنی اولاد کو جہنم کے گڑھے میں گرتا ہوا نہیں دیکھا جاتا، لیکن جمال مجبور تھا

....

ثانی آج کئی مہینوں بعد گھر آیا تھا مگر گھر میں

موجود گہری خاموشی نے اس کا چوکنا کر دیا تھا ثانی صحن سے ہوتا ہوا جب باپ کے کمرے میں پہنچا تو باپ کی چارپائی کو خالی دیکھ کر ثانی نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا، ماں نے ایک بھیگی آنکھوں کو دوپٹے کے پیچھے چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ثانی کی دنیا ویران ہو چکی تھی، ثانی دیر تک ماں سے گلے لگ کر روتا رہا یہاں تک غشی نے اس کے حواس معطل کر دیے، آنکھ کھلی تو ماں سرہانے کھڑی رو رہی رہی تھی، ماں نے ثانی کے باپ کی داستانِ مرگ آنسوؤں کی جھڑی میں سنائی تو ثانی پر غم کے بادل گہرے ہوتے چلے گئے۔کاش وہ گھر سے نہ گیا ہوتا، کاش وہ باپ کی میت کو کاندھا دے پاتا کاش وہ باپ کے دکھی دل کا مرہم بنتا۔مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا، پچھتاوے کی آگ ثانی کو راکھ کر رہی تھی۔۔۔۔ثانی کے قدم بے اختیار قبرستان کی طرف بڑھ رہے تھے باپ کی قبر پر پہنچا تو ثانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک نا رکنے والی برسات تھی اس کا پورا جسم اس برسات سے بھیگ رہا تھا، ثانی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ شام کا سورج غروب ہو گیا اور قبرستان ایک گہرے اندھیرے میں ڈوب چکا ہے۔اب کون تھا جو ثانی کو سہارا دیتا، ہر رشتہ ثانی سے منہ موڑ چکا تھا ایک باپ رہ گیا تھا جو ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتا آج وہ بھی منوں مٹی تلے دفن ہو چکا تھا۔ثانی بوجھل قدموں سے قبرستان سے لوٹا تو اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا چہرے پر ندامت اور خوف کا آثار نمایاں تھے۔ثانی کے قدم جس طرف اٹھ رہے تھے وہ راستہ گھر کو نہیں جاتا تھا۔

....

یہ پاکپتن شریف کی نورانی فضا ہے عقیدت مندوں کے ٹولیاں جوک در جوک دربار پر حاضری دے کر عجز و انکساری کا پیکر بنے رخصت ہو رہی تھیں ۔لوگوں تسبیح و دعا میں مگن تھے، بچے اپنے بڑوں کی ٹانگوں سے لپٹے ارگرد کے ماحول کو جائزہ لیتے ہوئے اس کو سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔مزار کے احاطے میں ایک بزرگ محو دعا تھا، اس بزرگ کو لوگ نا جانے کب سے اسی حالت میں دیکھ رہے تھے، یہ بزرگ ہمیشہ مزار کے احاطے میں موجود ہوتا، خاموش، گم سم سر جھکائے اپنی بوسیدہ چادر کو سر پر ڈالے تسبیح کے دانوں کو مسلسل گردش میں رکھتا، سفید داڑھی، لمبی زلفیں، چہرے پر بلا کا نور آنے والوں سے بے نیاز بس اپنی موج میں گم، کچھ عقیدت مند آتے جاتے بابا سے ہاتھ ملاتے، ہاتھوں کو جھک کر بوسے دیتے رخصت ہو جاتے یہ عمل بھی پچھلے کئی سالوں تو اتر سے ہو رہا تھے کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی عقیدت مند بابے کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور کلام کرنے لگتا، کوئی خوش نصیب ہوتا جس کی باتوں کا جواب بابا دے دیتا ورنہ اکثر نامراد ہی لوٹے، عقیدت مندوں میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ جس کی مراد پوری ہونی ہوتی بابا اسی سے کلام کرتا ہے۔اور کبھی تو ایسا ہوتا کہ تسبیح کے دانوں کے ہمراہ سسکیوں کی آوازیں ارد گرد کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

....

آج جمعرات تھی اور مزار کے احاطے میں عقیدت مندوں کا جمِ غفیر تھا لوگ نظر نیاز میں مگن تھے۔اپنے من کی مرادیں لے کر جا رہے تھے۔مزار کے احاطے میں ایک طرف دیوار کے سائے میں سر جھکائے اپنی بوسیدہ چادر میں لپٹا بابا بیٹھا ہوا تھا۔اپنی کم گوئی کی بدولت مزار کے تمام ملنگوں میں ممتاز ہو چکا تھا اگر کوئی عقیدت مند کلام کرنے پر اصرار کرتے تو بابا طیش میں آ جاتا اور کہتا" میں تو خود ٹھگ ہوں مکار ہوں، جھوٹا ہوں میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں دعا کروانی ہے تو سچے بزرگ کے پاس جاؤ میرے پاس اپنا وقت ضائع مت کرو، میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے میں تو خود لینے آیا ہوں" لیکن عقیدت مند بابے کی بات کو برا نہ مانتے اور کچھ دیر کے لیے بابے سے دور ہو جاتے جب تیور بدلتے تو پھر بابے کے پاس آ کر بیٹھ جاتے اور دیر تک منتظر رہتے کہ وہ کوئی بات کرے، کوئی کوئی خوش نصیب ہوتا جو بات کرنے میں کامیاب ہو جاتا ورنہ بیشتر لوگوں کو ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑتا۔جانے کیا بات تھی کہ دن بدن عقیدت مندوں کی تعداد بڑھ رہی تھی، مزار پر حاضری دینے والے بابے سے مل کر ضرور جاتے، کچھ لوگ اب اس کو بابا کرنی والے کے نام سے پکارنے لگے تھے، بابا اب بھی کس دیوار کے سائے میں سر جھکائے تسبیح کے دانوں کو جنبش دیتا اور سامنے بیٹھے ہوئے عقیدت مندوں سے بے نیاز رہتا ایک دن کسی نے کلام کرنے کی کوشش کی تو بابے کو ناگوار گزرا عقیدت مند سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ٹھگوں سے منزل کا پتہ نہیں ملتا جا حاضری دے اور اپنا کام کر، عقیدت مند چلا گیا تو زیر لب بولا" سرکار میری تنہائی مجھ سے مت چھینو، میرا اور امتحان مت لو میں پہلے ہی ہر امتحان میں فیل ہوتا آ رہا ہوں"

....

شام ڈھلنے لگی تو عقیدت مندوں کے بادل چھٹ گئے ایک ایک کر کے عقیدت مند اپنے دامن میں آس اور امید کے موتی لیے رخصت ہو چکے تھے۔بابا کرنی والا اپنی بوسیدہ سی چادر میں لپٹا ہوا مزار کے

مغربی دیوار کے سائے تلے سسکیاں لے رہا جب، سسکیوں کی آواز مزار کے در و بام سے ٹکرانے لگی تو غنودگی کا ایک گہرا جھونکا آیا سسکیاں دم توڑ گئیں، بابا بوسیدہ چادر میں لپٹا کسی میت کی طرح پڑا تھا۔ یکا یک ایک نور کے ہالے نے میت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ بابا کو یوں لگا جیسے کوئی بزرگ اس سے محوکلام ہے۔ گہری غنودگی کی کیفیت چھٹنے لگی۔ بے جان جسم میں کچھ جنبش ہوئی تو دور بیٹھے ملنگ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا کر تسبیح کے دانوں کو جنبش دینے لگا۔ بابا کی بوڑھی آواز اس کے اپنی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ یہ آواز اتنی مدھم تھی کہ دور بیٹھا ملنگ اس آواز کو سن نہ سکتا تھا۔ آواز میں التجا تھی ادب تھا، گزارش تھی، عاجزی تھی" آپ تو جانتے ہیں کہ میرا تن میرے من سے گندا ہے اور میرا من میرے تن سے گندا ہے مجھے سرکار کے آگے شرمندہ نہ کرنا میرے کاندھوں پر پہلے ہی بہت ندامت کا بوجھ ہے" یکا یک ایک نورانی آواز نے اس کے کانوں میں شہد گھولا" خدا سے سزا نہ مانگ جزا مانگ وہ رحیم بھی ہے وہ کریم بھی مایوسی کفر ہے ناامیدی اس کو پسند نہیں ہے توبہ کا در کبھی بند نہیں ہوتا" آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

دور بیٹھا ملنگ اسی طرح تسبیح کے دانوں کو جنبش دے رہا تھا۔ مزار کے احاطے میں ابھی تک اگربتیوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ بابا کے چہرے پر کسی گہری جھیل جیسا سکون نظر آ رہا تھا بشارات کے خواب کی چمک اس کی آنکھوں کو جگمگا رہی تھی، چہرہ مایوسی اور ناامیدی کی زردی سے پاک تھا۔ بابا رینگتا ہوں وضو گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ نماز فجر ادا کی تو دیر تک سجدے میں پڑا رہا سسکیاں لیتا رہا یہاں تک کہ عقب سے ایک ملنگ نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا اور پانی کا پیالہ پیش کیا، بابا نے مڑ کر دیکھا تو وہ ملنگ جو رات کو تسبیح کے دانوں کو سر جھکائے جنبش دے رہا تھا چپ چاپ کھڑا تھا۔ بابا کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں سرخی چھائی ہوئی تھی۔ بابا اٹھا ملنگ کے سہارے سے اسی مغربی دیوار کے سائے میں آ کر بیٹھ گیا جہاں شب بیداری کی تھی، ایک دوسرے ملنگ نے لنگر خانے سے چائے لا کر پیش کی،، پہلا گھونٹ حلق سے اترا تھا کہ خون کی الٹی آ گئی، مزار کے صحن نے سرخ چادر اوڑھ لی۔ نمازی، ملنگ، عقیدت مند دوڑے، بابا جی کو اٹھا کر چارپائی پر لیٹا دیا کسی عقیدت مند نے ایمبولینس بلائی اور بابا جی کو قریبی ہسپتال لے آئے۔ ڈاکٹر زاپنی سر توڑ کوشش کر رہے تھے، انتہائی نگہداشت کے وارڈ کے کھڑکی سے باہر کھڑے لوگ محو دعا تھے کہ ایک نوجوان ڈاکٹر سفید گاؤن پہنے ہوئے باہر آیا اور افسردہ لہجے میں اعلان کرنے لگا کہ بابا جی کی حالت ٹھیک نہیں ہے بہتر ہے کہ ان کو گھر لے جائیں اور ان کو دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔

گلی میں موجود لوگوں کی بھیڑ نے راہ گیروں کے لیے چلنا مشکل کر دیا تھا۔ لوگ گلی میں کھڑے کسی کے آنے کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک ایک ایمبولینس گلی میں داخل ہوتے دیکھ کر لوگوں میں بے چینی پھیل گئی آج جمال مرحوم کے آنگن میں خوشی اور دکھ کے ملے جلے موسم ڈیرہ ڈالے ہوتے تھے، شاید گاؤں کے نوجوان لڑکے اس بات سے واقف نہیں تھے لیکن، گاؤں کی بوڑھی عورتیں اور ضعیف بابے پوری تاریخ اپنی ذہنوں میں محفوظ کیے ہوئے تھے ان کو معلوم تھا کہ کون آ رہا ہے، لوگوں نظروں میں ایک دوسرے سے بیسوں ایسے سوال پوچھ رہے تھے جن کا جواب کسی دوسرے کے پاس نہیں تھا، پورا گاؤں کی نظریں بابا جمال مرحوم کے گھر پر لگی ہوئی تھیں، ایمبولینس گھر کے دروازے پر آ کر رکی تو صحن میں موجود لوگ دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ محلے کے لوگ چارپائی کندھوں پر اٹھا کر صحن میں رکھ دی۔ سسکیوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں، سب کی آنکھیں اشک بار تھیں، ثانی کی بوڑھی آنکھیں اپنے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ہر چہرہ شناسا سا تھا ہر شخص اس کا واقف تھا اچانک نبض ڈوبنے لگی، سانس اکھڑنے لگی ماضی آنکھوں کے سامنے کسی موجزن دریا کی طرح امڈ آیا ، لاحاصل سے حاصل تک سفر ظاہر سے باطن کا سفر ایک منزل سے دوسری منزل کی مسافت کے دوران ہونے والے تمام واقعات ایک اک کر کے ذہن کے پردہ پر ظاہر ہو رہے تھے، اور پھر اچانک ایک ہچکی کی آواز صحن کی دیواروں سے ٹکرائی۔۔ رونے کی آوازیں گلی میں کھڑے ہوئے لوگوں کی سماعتوں تک پہنچی تو باہر کھڑے لوگوں کی زبان سے بیک وقت ایک صدا ابھری۔۔ انا للہ وانا اللہ علیہ راجعون

کچھ ہی دیر میں گاؤں کی مسجد سے ایک آواز سنائی دیتی ہے" حضرات ایک ضروری اعلان سماعت فرمائیں سلیمان ثانی المعروف بابا کرنی والے باقضائے الٰہی سے انتقال کر گئے ہیں، جنازے کا اعلان بعد میں کیا جائے"

چُبھن

تسنیم کوثر

کمرے میں ٹرائم کی جلترنگ تھی یا پھر...... اُس کی دھڑکنوں کا شور اور وہ...... بس آنکھیں موندے، یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں گم تھی۔ جو کچھ بھی ہوا...... وہ اُسے ایک خواب لگ رہا تھا۔ شاید یہ خواب ہی تھا اُس نے سوچا لیکن...... اگر خواب تھا تو پھر...... اُس کے لبوں پر پیار کی حلاوتیں کس نے بکھیر دیں۔ یہ ریشمی بال کیسے اُلجھ گئے اور پھر...... شبنمی مہریں کون ثبت کر گیا اس کے مرمریں بازوؤں پر۔ یہ سوچتے ہوئے وہ لجا سی گئی۔ سرتا پا، کیف و سرور میں ڈوبی مہرو...... کچھ گھبرا سی گئی۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں اور...... آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر ڈالی مگر کوئی بھی نہیں تھا وہاں ...... بس کچھ میٹھی میٹھی سرگوشیاں کانوں میں مدھر تانیں بکھیر رہی تھیں۔ اُسے خود پہ حیرت ہونے لگی۔ وہ تو قربتوں سے گھبرا جاتی تھی...... اُکتا جاتی تھی...... تو پھر آج ایسا کیا ہو گیا تھا؟ جس نے مہرو کے من میں خوشیوں کی دھمال ڈال دی تھی۔ اُسے بسنتی رنگ میں رنگ ڈالا تھا۔ وہ پہلے کبھی اس کیفیت میں نہ ڈوبی تھی۔ کبھی اس طرح سے نہ مہکی تھی۔ دس برسوں کی تھکا دینے والی، رُلا دینے والی، اُکتا دینے والی بے شمار راتوں میں...... ایک رات بھی ایسی نہ تھی جو یوں شہد میں گھلی ہوئی ہو...... شبنم سے دُھلی ہوئی ہو...... یہ کیسے پل تھے جو...... اُس کے تن من کو مہکا گئے تھے۔ کیسے لمحے تھے جو سریلی تانیں بکھیر گئے تھے۔

دین محمد کو نہ تو فرصت تھی اور نہ کچھ کہنے کی عادت اور...... اب تو مہرو بھی اُس کے جیسی ہو گئی تھی۔ چپ چپ گم سم سی۔ دین محمد کے ساتھ سے پہلے...... اس کی آنکھوں میں بہت سے حسین خواب جل بجھ، جل بجھ کرتے تھے۔ بہت سے ریشمی پل سرسراتے تھے۔ کچی عمر کی لڑکیوں کے خواب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ من کو سلگانے والے، سوچ کو بہکانے والے، چاہتوں میں ڈوبے ہوئے اچھے گھر کے خواب، اچھے ساتھی کے خواب مگر...... مہرو بیچاری کے تو یہ سارے خواب اُسی روز چکنا چور ہو گئے تھے جس روز وہ دین محمد کی بیوی بن کر اس گھر میں آئی تھی اور گھونگھٹ کی اوٹ سے اُس نے بے ڈھنگے، کلم کلے دین محمد کی بکھری ہوئی بدرنگ...... بد ذوق سی زندگی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ بس...... تب سے اُس نے اپنی آنکھیں میچ لی تھیں۔ خواب دیکھنے چھوڑ دیے تھے۔ سب کچھ مقدر کا لکھا جان کر چپ سی ہو گئی تھی اور صرف...... دین محمد اور اُس کے گھر کو اپنی زندگی کا محور مان لیا تھا۔ دین محمد...... تھا تو ایک گھبرو جوان...... پر اُس کی خوبصورتی کو اُس کی غریبی چاٹ گئی تھی اور یہ غریبی اگر صرف دھن دولت کی ہوتی تو مہرو کو ہرگز دکھ نہ ہوتا۔ دین محمد بے چارہ تو دل کا بھی غریب تھا۔ بس اپنے کام میں مگن...... جذبات و احساسات سے عاری...... کبھی کبھی تو مہرو کو اُس پر کولہو کے بیل کا گمان ہوتا۔ جو آنکھوں پر پٹی چڑھائے بس اپنے محور کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ دین محمد بھی اپنے محور کے گرد گھومنے کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا۔ دفترانہ کام...... شوہرانہ کام...... اس کے سوا دین محمد کو شاید کچھ آتا ہی نہ تھا۔ مہرو بیچاری ہر رات...... دین محمد سے نظریں چراتی۔ دین محمد کی آنکھ رات کے کسی بھی پہر نہ کھلنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ دفتر دین محمد کی ضرورت تھی اور مہرو اُس کی تفریح......

دین محمد کی نیند ٹوٹنے کے بعد مہرو کو جس کرب سے گزرنا پڑتا تھا...... اُسے کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ رات کے کسی پہر وہ...... بچوں کے درمیان دُبکی ہوئی مہرو کو یوں دبوچتا جیسے بلی چوہے کو دبوچ لیتی ہے۔ مہرو نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بے جان مورتی کی مانند کسی کٹھ پتلی کی طرح دین محمد کے اشاروں پر ناچتی رہتی۔ اُس کے جبر پر چوں تک نہ کرتی۔ بس دم سادھے بے زاری سے آنکھیں میچے وہ اُس کی من مانیاں سہتی رہتی...... اور اس کے بعد رات کا جو حصّہ باقی بچتا مہرو اُسے چپکے چپکے آنسو بہا کے گزارتی۔ دین محمد کے وجود کی ناگوار باس اُسے سونے ہی نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی دین محمد کی قربت اسے آزردہ کیوں کر دیتی ہے؟ اتنا کرب کیوں دے جاتی ہے؟ کیا ساری عورتیں اسی کرب سے گزرتی ہیں میری طرح؟

اگر ایسا ہوتا تو کٹوی کی عورتیں اپنی راتوں کے قصے مزے لے لے کر نہ سنایا کرتیں۔ دس گھروں کی اس کٹوی میں ایک مہرو تھی جوان میں شامل نہ ہوتی۔ پتہ نہیں مہرو کے ساتھ ایسا کیوں تھا۔ یہ بھی نہیں کہ اس کی زندگی میں دین محمد سے پہلے کوئی تھا۔ وہ تو پلی بڑھی ایسے گھر میں تھی جہاں لڑکیوں کا گھروں سے باہر جھانکنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ تبھی تو اُسے اپنی اس اُکتاہٹ کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اب...... وہ وجہ سمجھنا بھی نہ چاہتی تھی۔ سمجھ کے کرتی بھی کیا؟

دین محمد کی بات نہ مان کر وہ کہاں جاتی؟

وہ اُسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی...... وہ اب اپنے اس محور سے نکلنا چاہتی تھی۔

بس...... وہ تو ٹیٹو نے ایک روز اُس کی زندگی میں ایسی ہلچل مچادی کہ وہ سنبھل نہ سکی۔ خس وخاشاک کی طرح اس کی ہستی ایک ایسے طوفان کی زد میں آ گئی جو غیر متوقع تھا۔ بنا کسی ارادے، بنا کسی خواہش کے ہی یہ سب ہو گیا۔

ادھر وہ الگنی پر کپڑے پھیلانے لگی اِدھر ٹیٹو آنکھ بچا کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ مہرو کی نظر پڑنے سے پہلے ہی ٹیٹو سیڑھیوں سے لڑھک چکا تھا۔ مہرو کے تو جیسے سناٹے نکل گئے۔ بے سدھ سی ہو گئی تھی وہ۔ پڑوس کی عورتوں نے مہرو کو سنبھالا اور محلے کے کچھ مرد ٹیٹو کو ہسپتال لے گئے۔ مہرو کو ہوش آیا تو آپا رجو نے بتایا کہ ٹیٹو کے سر پر گہرا زخم آیا ہے اور ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ یہ سن کر مہرو بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ دین محمد ڈیوٹی پر تھا۔ بڑے دونوں بچوں کو خالہ وحیدن کے حوالے کر کے آپا رجو کے ساتھ مہرو ہسپتال پہنچی۔ والہانہ ٹیٹو کی طرف لپکی مگر بڑھ کر روک دیا اُسے۔ مہرو نے روکنے والے پر نظر ڈالی۔ روکنے والا تھا تو اجنبی مگر اکثر اُسے دیکھا تھا مہرو نے خالہ وحیدن کے ہاں...... اُن کے بیٹے کا دوست اور دور پار کا عزیز۔ جس کی گہری سانولی رنگت اور لمبے لمبے بالوں کی شناخت پورے محلے میں تھی۔ اُس پر چاندی کا لاکٹ اس کی کالی سیاہ گردن میں زور سے لشکارے مارتا تھا۔ جب ٹیٹو گرا، اس وقت سلطان گلی کی نکڑ پر کھڑا تھا۔ گلی کے بہت سے مرد اپنے کام کاج کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ سلطان تو فرشتہ بن کے وہاں موجود تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مہرو کا کمزور سا دل جیسے لرز گیا۔

اُس نے دل ہی دل میں سلطان کا شکریہ ادا کیا۔ ٹیٹو بے ہوش تھا۔ شرارتی سے بچے کو یوں گم سم دیکھ کر مہرو دُکھی ہو گئی۔ آنکھیں بھر آئیں...... اُس نے سامنے نظر ڈالی ڈبڈباتی آنکھوں میں سلطان کی بیہ ہچکولے کھا رہی تھی۔

دین محمد کی آج ڈبل شفٹ تھی۔ ڈاکٹر ٹیٹو کو ٹریٹ منٹ دے رہے تھے۔ وہ اب ہوش میں تھا۔ رات کو ڈاکٹرز نے انھیں چھٹی دے دی...... اور مہرو رب کا شکر ادا کرتی ہوں آپا رجو اور سلطان کے ساتھ گھر آ گئی۔ آپا رجو اپنے گھر اُتر گئیں اور سلطان کو تاکید کر گئیں۔ بچے کے پاس ہی رہیو...... مہرو بچاری کہاں جاگ کر دوائی پلائے گی پہلے ہی صدمے سے ادھ موئی ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر نے ہر تین گھنٹے بعد دوا دینے کو کہا تھا۔ سلطان ٹیٹو کو سنبھالے ہوئے تھا اور مہرو تھکے تھکے انداز میں ٹیٹو کے سرہانے بیٹھی تھی۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب مہرو کو نیند کا جھونکا آ گیا۔ اتنے میں ٹیٹو کسمسایا...... مہرو ہڑبڑا کر اُٹھی، لپک کر ٹیٹو کو لینا چاہا...... اِسی لمحے...... سلطان نے ٹیٹو کو اُس کے قریب لٹا دیا۔ ٹیٹو پھر سو گیا تھا مگر مہرو...... مہرو اب جاگ گئی تھی اور...... اس کے ساتھ ساتھ اُس کی ساری حسیں بھی جاگ گئی تھیں۔ جھیل کے پرسکون پانی میں ہلچل مچ گئی تھی۔

سلطان کے ہاتھ کا لمس...... مہرو کو جگا گیا تھا۔ بہکا گیا تھا اور پھر...... وہ جو دین محمد سے اُکتائی ہوئی تھی۔ اس کے قربتوں کی ستائی ہوئی تھی کسی پکے ہوئے پھل کی طرح سلطان کی جھولی میں آ گری تھی۔ اُس کے سیاہ بالوں سے بھرے چوڑے چکلے کالے سینے سے جا لگی تھی۔ بنا یہ سوچے کہ اُس کی میدے سی شہابی رنگت کو سلطان کے رنگ کی سیاہی کہیں میلا نہ کر دے...... وہ اُس کی دھڑکنیں گن رہی تھی۔

یہ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ موم کی طرح پگھل گئی تھی۔ بتاشے کی طرح گھل گئی تھی۔ خود سپردگی کے سارے ڈھنگ آج اسے آپ ہی آپ آ گئے تھے اور پھر...... نائٹ بلب کی نیلی مدھم سی روشنی میں دو رنگ گڈمڈ ہو گئے تھے۔

سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا تھا۔ وہ سلطان کی بانہوں میں سمٹ کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ اب اسے دین محمد یاد تھا اور نہ ٹیٹو۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا وقت یونہی تھم جائے...... ذرا بھی نہ سرکے...... اور وہ یونہی اس کے سینے سے چمٹی، اس کی دھڑکنیں گنتی رہے۔ کوئی بات نہ کرے۔ کچھ نہ بولے بس......

دھیرے دھیرے...... ہولے ہولے...... اس کے پیار کی چاشنی من میں اُتارتی جائے۔ اپنا آپ نکھارتی جائے۔

مگر وقت کب رُکتا ہے۔ پردے کی لرزش اور ٹرائم کی جلترنگ سلطان کے جانے کی گواہ تھیں...... وہ جاچکا تھا اُسے سیراب کر کے۔

لمحے بھر کی قربت سے روح کے گلاب مہکا کے۔

مہرو کی برسوں کی تھکن سمیٹ کر وہ جا چکا تھا۔

اور مہرو آنکھیں موندے پڑی تھیں۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیوں میں چند حسین ساعتیں جیسے ٹھہر گئی تھیں۔

وہ انہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

کیا ہو گیا تھا؟ کیوں ہو گیا تھا؟ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

جانے کب تک وہ اسی کیف و جذب کی کیفیت میں رہتی کہ...... ٹیٹو کے رونے کی آواز اُسے اس کیفیت سے نکال لائی۔

مہرو نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں...... آگے بڑھ کے ٹیٹو کو اُٹھانا چاہا مگر اُس کے پاؤں کانچ کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اُلجھ گئے...... وہ تیزی سے اُٹھ بیٹھی۔

کانچ کے یہ سارے ٹکڑے...... دھیرے دھیرے اس نے چنے۔ ایسا کرتے ہوئے ایک ٹکڑے کی باریک سی نوک مہرو کی اُنگلی کو زخمی کر گئی...... وہ تڑپ اُٹھی۔ چبھن نے اُسے بے حال کر دیا تھا۔ اس کی چبھن میں اضافہ ہونے لگا۔ کہیں...... کچھ کچھ دل میں بھی ہو رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے چوڑیوں کے یہ چھوٹے چھوٹے باریک سے نشتر اُس کے ننھے سے دل میں پیوست ہو گئے ہوں۔

اُس کا روم روم شرمسار ہو گیا۔ وہ سرتاپا ندامتوں میں گڑھ گئی تھی۔ یہ کیا کیا اُس نے؟ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ ٹیٹو رو رہا تھا۔

مہرو بھی رو رہی تھی۔ روتے روتے اُس نے کانچ کے ان ٹکڑوں کو دیکھا جو بستر کی شکنوں میں دُبکے ہوئے تھے۔ بستر کی شکنوں سے زیادہ شکنیں اُس کی روح پر پڑی تھیں۔ کانچ کے ٹکڑوں سے زیادہ ٹکڑے اُس کے دل کے ہو گئے تھے۔

وہ یہ کیا کر بیٹھی تھی؟ اتنی کمزور کب تھی وہ؟

مہرو نے سوچا غلطی اُس کی اپنی تھی۔ شبہ بھی اُسی کی تھی۔ اُس نے ہی چاہا تھا یہ سب...... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے اُس نے چوڑیوں کے وہ سارے ٹکڑے اکٹھے کیے۔ کانچ کے ذروں کو چنا اور ٹشو پیپر میں لپیٹ لیا۔ قریب پڑا پرس کھولا اور سارے ٹکڑے سارے ذرے اپنے پرس میں رکھ لیے۔ اپنے دل میں سمیٹ لیے۔

وہ ان ٹکڑوں کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ اپنی غلطی کی پہلی اور آخری یادگار مان کر۔ اپنے پہلے اور آخری گناہ کی پاداش میں...... جو وہ نادانستگی میں یا شاید دانستہ کر بیٹھی تھی۔

تازہ غزلیں

قمر ریاض مسقط

بات پھیلی اِدھر اُدھر میری
سوچ اتنی تھی معتبر میری
فون آیا تھا اُس کا گاڑی میں
پھر تو خوشبو تھی ہم سفر میری
شہر تک اس میں ڈوب جائے گا
آنکھ ہوتی رہی جو تر میری
بے خبر کر دیا مجھے اُس نے
جس نے رکھنی تھی سب خبر میری
کون گزرا ہے اس طرف سے قمر
یہ جو مہکی راہ گزر میری

....

مت نگاہیں جھکا کے مجھ سے ملو
آنکھ ہے تو ملا کے مجھ سے ملو
چند باتیں اُدھار ہیں تم پر
آخری بار آ کے مجھ سے ملو
پھول لایا ہوں میں تمہارے لیے
آج خود کو سجا کے مجھ سے ملو
مان لی ہیں تمہاری سب باتیں
اب ذرا مسکرا کے مجھ سے ملو
جو ہواؤں میں ریت پر لکھا
چھوڑو اُس کو مٹا کے مجھ سے ملو
جانتا ہوں کہ دل جلاتے ہیں
خط پرانے جلا کے مجھ سے ملو
شیشہ گر ہوں نہ کوزہ گر ہوں قمر
تم جو چاہو بنا کے مجھ سے ملو

سلور جوبلی

نادیہ احمد بشیر

زندگی کے حسین دور کے 25 سال گزر چکے تھے اور کیا واقعی ہی یہ دور حسین تھا؟ یا کہ صرف کتابی زبان میں اسے حسین کہنا ضروری ہے؟ اسے مبارک باد کے پیغامات وصول ہو رہے تھے۔ دوست، احباب، عزیز و اقارب اس سلور جوبلی کے موقع پر اس سے دعوت کی طلب کر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا یہ ایسا موقع ہے؟ ایسا دن ہے کہ اسے دعوت کا انتظام کرنا چاہیے؟ کوئی پارٹی۔۔۔کوئی جشن۔۔۔۔

اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو کئی ایک واقعات ذہن کے پردے پر ابھرے۔ کیا کیا خواب آنکھوں میں سجا کر اور کیسی دھوم دھام سے اس کی شادی ملک ابرارالحسن سے ہوئی تھی۔ سب سہیلیاں، رشتے دار اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ لیکن تقدیر۔۔۔ ہنس رہی تھی۔ پھر جو زندگی شروع ہوئی وہ بس "زندگی" ہی تھی جو چلتی چلی جا رہی تھی۔ کتنی بار اس نے سوچا کہ اس زندگی سے بھاگ جائے لیکن کبھی ماں باپ کی عزت، کبھی بہن بھائیوں کے چہرے، کبھی رشتے دار تو کبھی سماج آڑے آجاتا۔ ملک ابرارالحسن، جنہوں نے اسے زندگی کی ہر سہولت مہیا کی لیکن اسے وہ بنیادی سہولت نہ دی جو ہر عورت کا حق ہے۔ اس نے جب پہلی بار ملک ابرارالحسن کا دوہرا چہرا دیکھا تو گم سم سی ہو گئی اور پھر یہی گم سم سا رہنا اس کی شخصیت کا خاصا بن گیا۔ کیا اسے دیکھ کے کوئی کہہ سکتا تھا کہ اس نے ایم ایس سی ماس کمیونیکیشن کر رکھا ہے؟ وہ جو کالج کی صف اول کی ڈیبیٹر تھی۔ نہیں وہ تو بولتی ہی نہ تھی، جانے خود سے ناراض تھی کہ قدرت کے اس فیصلے سے۔

جب پہلی بار وہ امید سے ہوئی تو یہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی خوشی تھی۔ اس کے بیٹے ملک سراج الحسن کی پیدائش پر اسے لگا شائد زندگی اب کسی ڈگر پر آجائے اور ملک ابرارالحسن کو گھر سے کوئی دلچسپی پیدا ہو جائے لیکن وہ تو دوستوں کے ساتھ پیرس کے دورے پہ نکل کھڑے ہوئے کہ گھر میں مہمانوں کا آنا جانا ہے تو ان کا دل گھبراتا ہے۔ ملک ابرارالحسن کے دن مصروف اور راتیں رنگین تھیں۔ انہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ گھر میں جو عورت ہے وہ بھی انسان ہے اس کے بھی کچھ تقاضے، کچھ خواہشات ہیں۔ اور جب کبھی غلطی سے اس نے ان خواہشات کے اظہار کی کوشش بھی کی تو سختی سے اس کی زبان بند کر دی گئی۔ ملک ابرارالحسن جیسی شائستہ، دھیمی اور میٹھی شخصیت کبھی کسی پر ہاتھ بھی اٹھا سکتے ہیں؟ کوئی مان ہی نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتی کہ کسی کو کس طرح سے کہے اور کیا کہے؟ ایک بار اس نے ہلکے سے اپنی ماں سے ذکر کیا لیکن اس کی ماں نے ہنس کے کہا مذاق نہ کرو۔ تب اسے احساس ہوا کی وہ تو اپنی سچائی کو بھی نہ منوا سکے گی اور "وہ جھوٹ بھی بولے گا تو جیت جائے گا" اس دن کے بعد تو اس نے کبھی منہ کھولنے کا سوچا ہی نہیں۔ زندگی چلتی گئی اور وقت دوڑتا چلا گیا۔ دوسری بار جب وہ امید سے ہوئی تو دن رات دعائیں کرتی کہ اللہ اسے بیٹی کی نعمت سے نوازے کہیں ایک موہوم سی امید تھی کہ شائد ملک ابرارالحسن بیٹی کی پیدائش سے ہی کچھ بدل جائیں لیکن اس کی ان امیدوں پر بھی پانی پڑ گیا زرفشاں کی پیدائش بھی ان کے دن رات کی روٹین نہ بدل سکی۔ اس کے بعد تو اس نے سب امیدیں ہی چھوڑ دیں۔ وہ خیالات کی دنیا سے حال میں لوٹ آئی تو کیا آج کا دن کوئی اہمیت رکھتا تھا؟

پچھلی رات ہی تو گلنار کا فون آیا تھا اور وہ بڑی "بے چینی" سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ملک صاحب کا فون ناٹ ریچ ایبل ہونے کی وجہ سے اس نے پی ٹی سی ایل پر بڑی ڈھٹائی سے فون کر کے اپنا پیغام پہنچانے کا کہا۔ اس نے جب ابرارالحسن سے ہلکا سا استفسار کیا تو ساری رات بخار میں پھٹنک کے گزارا۔ اور آج ابرارالحسن دو دن کا کہہ کر کسی "سرکاری دورے" پر روانہ ہو گئے۔ اس نے پچھلے 25 سال کا جائزہ لیا تو اس کے اندر تلخی اترتی چلی گئی۔ کیا اب اسے وہ فیصلہ کر لینا چاہیے جو وہ 25 سال میں نہ کر سکی؟ وہ اٹھی اور ایک عزم کے ساتھ الماری کھولی اور اپنی ضرورت کی اشیاء نکالنے لگی۔ سامنے 25 سال کی یادیں بکھری پڑی تھیں سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا رکھے تو کیا اٹھائے؟ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی سہیلی شگفتہ کے پاس مری چلی جائے گی اور پھر آگے کا آگے سوچا جائے گا۔

دروازہ بجا اور زرفشاں کمرے میں داخل ہوئی اس کے گلے میں بانہیں ڈال کے بولی "مما مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے" "جی بیٹا" وہ بڑی شفقت سے بولی۔ "مما شمریز کے پیرنٹس آنا چاہتے ہیں، آپ سمجھ رہی ہیں نہ کیوں؟ اور آپ پاپا سے بھی بات کر لیں گی نہ؟" ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا اور مسکرا کر سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے بیٹا اس سنڈے بلوا لو" "تھینک یو مما" زرفشاں خوشی سے باہر نکل گئی۔ اور اس نے اپنے کپڑے واپس ہینگر پر لگانے شروع کر دیئے۔

باپ کی چِتا

سعدیہ بتول

یہ جون کی ایک تپتی دوپہر تھی۔ عبدالقیوم چوہڑ چوک میں رکشہ لیے سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد کندھے پر رکھے رومال سے اپنا پسینے بھرا منہ پونچھتا۔ یوں لگ رہا تھا گویا بدن کے مسام فوارہ بن کر پانی اُگل رہے ہوں۔ آج تو غضب کی گرمی ہے توبہ! لگتا ہے سورج شعلے برسا رہا ہے۔ کوسنے کی آواز سن کر عبدالقیوم نے رکشے سے سر باہر نکالا کوئی بوڑھا بڑبڑاتے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ وہ تو گزر گیا لیکن قیوم کی نگاہیں ایک رکشے کی پشت پر اٹک کر رہ گئیں۔ اس پر یہ الفاظ درج تھے۔ "یہ سب میری ماں کی دعا ہے" اس جملے کے ساتھ ہی اس قسم کے کچھ اور جملے بھی اس کے ذہن میں کلبلانے لگے "ماں کی دعا جنت کی ہوا"، "ماواں ٹھنڈیاں چھاواں" وغیرہ وغیرہ۔ اسے رہ رہ کر یہی خیال ستانے لگا کہ آخر باپ بھی تو صبح سے شام تک اولاد کی خاطر ہی تگ و دو کرتا ہے لیکن اس کی قربانیوں کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ بے شک اولاد کو پیدا کرنے اور پالنے میں ماں سخت مراحل سے گزرتی ہے لیکن باپ بھی تو اپنی زندگی اولاد کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ آج اگر اسے اپنے بچوں کی فکر نہ ہوتی تو وہ کبھی اس چلچلاتی گرمی میں سڑک پر نہ نکلتا۔ بے اختیار اس کا ذہن اپنے روز و شب کے پھیر میں اُلجھ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ آج سے دس سال پہلے وہ بالکل مختلف عبدالقیوم تھا جس کی زندگی کا مقصد صرف اچھا کھانا کھانا، دوستوں سے گپیں لگانا اور دن چڑھے تک سوئے رہنا تھا۔ اس کی زندگی میں تبدیلی تب آئی جب شادی کے بعد اس کے ہاں عاطف اور انعم کی پیدائش یکے بعد دیگرے ہوئی۔ اب تو وہ بے فکری کے وقت کو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ اسے تو اب دن رات ایک ہی فکر تھی کہ اس کے بچے اچھی پرورش پا سکیں۔ ان کو کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ وہ اچھی تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں باعزت مقام پا سکیں۔ یہی وہ خواب تھا جن کے پورا کرنے کے لیے وہ سو جتن کرتا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کے لیے اپنا آرام سکون تج دیا تھا۔

بھائی! "صدر تک جانے کیا کیا لو گے؟"

(ایک خاتون اس سے مخاطب تھی) اسی روپے

اُف توبہ توبہ! کیا زمانہ آ گیا یہ دو قدموں پر تو صدر ہے میں تو ساٹھ روپے دوں گی۔

اچھا بہن جی ستر روپے دے دیں۔ ہم لوگ بھی کیا کریں پٹرول کے نرخ دن بدن بڑھ رہے ہیں۔

اچھا اب چلو بھی!!! ایک تو گرمی اتنی زیادہ ہے اوپر سے تم لوگوں کے منہ مانگے کرائے۔ (خاتون رکشے میں بیٹھتے ہوئے بڑبڑائی)

اس نے رکشہ اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا کہ لوگ بڑے بڑے شاپنگ مالز سے ہزاروں کی شاپنگ کر لیتے ہیں بڑے بڑے بل ادا کرتے ہوئے ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی لیکن ہم غریبوں سے بھاؤ تاؤ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ بحث کرنے کا اصول شاید نچلے طبقے کے لیے ہی مخصوص ہے۔ وہ کلس کر رہ گیا۔ ہاں بھئی! اب اونچی اونچی دکانوں میں مول تول کر کے یہ لوگ اپنی ہتک تو نہیں کروا سکتے نا! وہ ایک آہ بھرتے ہوئے رکشہ سائیڈ پر لگانے لگا اور وہ خاتون جلدی سے اسے پیسے تھما کر ایک ایئر کنڈیشنڈ شاپنگ مال میں داخل ہو گئی۔ اب ایک بار پھر وہ سواری کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ بہت محنتی شخص تھا۔ اسے اپنا پندار اور خودداری بہت عزیز تھی۔ وہ اپنی جان پر ہی سختی سہہ سکتا تھا لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا تھا۔ سورج نکلنے کے ساتھ ہی اپنا رکشہ نکال کر سڑک پر آ جاتا اور پھر چل سو چل۔ دن بھر لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں برداشت کرتا۔ گرمی سردی کے تھپیڑے کھاتا۔ اپنی بھوک اور بیماری سے قطع نظر سخت محنت کرتا۔ جب مایوس ہونے لگتا تو بچوں کے معصوم چہرے اس کے من میں از سرِ نو اک نئی جوت جگا دیتے اور وہ پھر سے پرعزم ہو جاتا اور شاید ہر باپ اپنے اپنے انداز میں یہی کچھ کرتا ہے۔ اب ایک بار پھر اس کی سوچ کا دھارا صبح والے خیالات کی طرف مڑ گیا اور وہ بے اختیار سوچ گیا کہ معاشرے صرف ماں کی قربانیوں کی مثال یوں دیتا ہے۔ باپ بیچارے کا کہیں نام آتا بھی ہے تو بہت ماٹھا سا۔ اس کم بخت کو تو صرف اس کی موت کے دن خراجِ تحسین پیش کر کے گویا اس پر احسان عظیم کر دیا جاتا ہے اور وہ بھی ان ملامتی الفاظ میں کہ "ہا! بچوں کو یتیم اور بے آسرا کر گیا۔" گویا اس ظلم میں بھی اسی کا کوئی ہاتھ ہو۔

اعتبار ساجد/لاہور

آخری بوسہ دیا طفل کی پیشانی پر — اور پھر رات گئے باپ نے گھر چھوڑ دیا

اعتبار ساجد جذبوں اور خوابوں کی شاعری کرتے ہیں۔ چاہے اس کے لیے کوئی شام اُدھار ہی کیوں نہ مانگنی پڑ جائے۔ اعتبار ساجد انتہائی ذہین، حساس اور خوبصورت ذہن اور دل کے مالک ہیں۔ زندگی کا ایک طویل عرصہ درس و تدریس، صحافت و شعر و ادب میں گزارا ہے۔ اعتبار ساجد کی مقبولیت کی وجہ ان کا مخصوص اسلوب اور اندازِ فن ہے۔ اعتبار ساجد کی شخصیت میں اتنا سحر ہے کہ جس محفل میں بھی شریک ہوں ان کے پرستاران کے ارد گرد منڈلانے لگتے ہیں۔ اعتبار ساجد کی شاعری نوجوان نسل میں بہت مقبول ہے۔ خاص کر ان کی کتاب ''مجھے کوئی شام اُدھار دو'' کو اتنی مقبولیت ملی کہ جس کا کوئی بھی شاعر خواب دیکھ سکتا ہے۔ (میجر (ر) خالد نصر)

یہ قمقمے، یہ عمارات، یہ فضا کیا ہے
جو تم نہیں ہو تو اس شہر میں دھرا کیا ہے
مجھ ایک گوشہ نشیں آدمی کو کیا معلوم
کہ شام کیسی ہے اور باغ کی ہوا کیا ہے
مجھے خبر نہیں کس شہر میں مقیم ہے تو
تجھے بھی علم نہیں اب مرا پتا کیا ہے
بدن اُتار کے یہ دیکھنا پڑے گا مجھے
کہ میری رُوح میں موجود اک خلا کیا ہے
مجھے وہ عمر کے اس موڑ پر ملا ہے جہاں
میں خود سے پوچھتا رہتا ہوں مدعا کیا ہے
تمہیں تو نیند ستانے لگی ہے سو جاؤ
مری کہانی ہے جاری، ابھی سنا کیا ہے
پہنچ کے منزلِ مقصود پر وہ پوچھے گا
یہاں سے لوٹنا چاہوں تو راستا کیا ہے؟

اس طرح ہرگز نہ میری چشمِ نم پر سوچنا
اپنی آنکھیں پونچھ لو پھر میرے غم پر سوچنا
پہلے تم اپنے مسائل سے رہائی پا تو لو
پھر اگر فرصت میسر ہو تو ہم پر سوچنا
کیوں برس جاتا ہے صحرا میں مگر میں کیوں نہیں
کیسا ناانصافی ہے ابرِ کرم پر سوچنا

عشق میں جو زخم بھی مل جائے گوہر جانئے
اس رہِ بے فیض میں کیا بیش و کم پر سوچنا
ایک دن آباد ہونا ہے جہاں جا کر تمہیں
مملکت کے ساتھ اُس ملکِ عدم پر سوچنا
پڑ گئی عادت ہمیں ترکِ مراسم کے طفیل
ہر جفا کو یاد رکھنا ہر ستم پر سوچنا
جانے وہ کیسا مصنف ہے، لکھا جس نے تمہیں
ایک دن خالق کے بھی زورِ قلم پر سوچنا

سکون و راحت قلب و جگر بھی آ جائے
کوئی چراغ بکف اس نگر بھی آ جائے
درِ خزاں پہ کھڑا دیکھتا ہوں برگ و ثمر
یہ فصلِ گل ہے تو پھر میرے گھر بھی آ جائے
یہ کارِ عشق ہے، اخبار کا ضمیمہ نہیں
کہ اس جنوں کی نمایاں خبر بھی آ جائے
مزاحمت کے تو رستے پہ گامزن ہے وہ
سبک خرام ذرا دار پر بھی آ جائے
قدم قدم پہ یہ کیا سوچتے ہیں سہل پسند
خدا کرے کہ رہِ مختصر بھی آ جائے
بنامِ درد، مسیحا بھی ہے ہمیں درکار
بہ پاسِ زخم، کوئی چارہ گر بھی آ جائے

سنا ہے تیر کوئی ڈھونڈتا ہے اپنا ہدف
اب اس کی زد میں دلِ بے خبر بھی آ جائے
سنا ہے اس کو سفر کا ہے اشتیاق بہت
اسے کہو کہ کسی دن اِدھر بھی آ جائے

جانشینی کا ہر اک لعل و گہر چھوڑ دیا
اُس نے بن باس لیا، راج نگر چھوڑ دیا
اپنی پوشاک بھی، پاپوش بھی، زینے پہ دھری
جتنا پایا تھا جہاں سے وہ اِدھر چھوڑ دیا
آخری بوسہ دیا طفل کی پیشانی پر
اور پھر رات گئے باپ نے گھر چھوڑ دیا
سادھ لی چپ کہ سنے ہاتفِ غیبی کی صدا
بے سبب گفتگو کرنے کا ہنر چھوڑ دیا
کوئی کشتی ہے نہ پتوار، نہ ساحل کی اُمید
زندگی! تو نے ہمیں بیچ بھنور چھوڑ دیا
میری منزل کا پتہ بھی تھا اُسی کو معلوم
ساتھ جس نے مرا دورانِ سفر چھوڑ دیا
کون سا خوش تھا ترے قصر کے سائے میں فقیر
کیا پڑا فرق اُسے تو نے اگر چھوڑ دیا
اب نہیں مانگی خیراتِ محبت تجھ سے
جا، تری خیر ہو ہم نے ترا در چھوڑ دیا

انمول گوہر/ملتان

یہ الگ ہے کہ محبت لوٹنے دیتی نہیں
لوٹ آنے کے وگرنہ راستے تو ہوتے ہیں

ہمیں ان چاند چہروں میں نہ اُلجھاؤ چلے جاؤ
ادھورے خواب ہیں سارے نہ دکھلاؤ چلے جاؤ
ہمیں معلوم ہے جا کر کوئی واپس نہیں آتا
ہمیں جھوٹی تسلی سے نہ بہلاؤ چلے جاؤ
ہمارا حال غیروں کی طرح مت پوچھنا آ کر
تمہیں زیبا نہیں دے گا یہ برتاؤ چلے جاؤ
ہمیں یہ کاٹ لینے دو سزا جرم محبت کی
ہمارے سر سے سورج کو نہ سرکاؤ چلے جاؤ
یہ حاکم بھی تو خواہاں ہے ازل سے آمریت کا
یہ جمہوری اصول اس کو نہ سمجھاؤ چلے جاؤ
کھڑے کیوں ہو ہمارے تم در و دیوار سے لگ کر
مسائل پہلے اپنے گھر کے سلجھاؤ چلے جاؤ
کبھی ناصح بھی کر پایا علاج فرقت یاراں
نہ ساون آنکھ سے گوہر یوں برساؤ چلے جاؤ

کس قدر بے کلی ہے صورتِ حالات میں
لوگ گاتے جا رہے ہیں حادثے نغمات میں
اس غمِ دوراں سے ہم کو کب ملی ہیں فرصتیں
کس طرح آباد کرتے ہم محبت ذات میں
کون در پر آ گیا کشکول ہاتھوں میں لیے
کون ہے جو مانگتا ہے زندگی خیرات میں
آج کل ہم کر چکے ہیں درد سے جب دوستی
اب یہ خوشیاں دے رہے ہو کیوں ہمارے ہات میں
روٹھتے ہی جا رہے ہیں روشنی کے قافلے
لگ نہ جائیں پھر اندھیرے اب ہماری گھات میں
فیصلہ تو دشمنوں کے حق میں لازم تھا وہاں
تم بھی شامل ہو چکے تھے اب ہماری مات میں
دیکھنا اب آسماں سے آئے گی یہ شاعری
کس کا تم کو ڈر ہے گوہر جب خدا ہے سات میں

دریچے یاد کے سارے مقفل کر دیے اُس نے
ادھورے خواب نفرت کے مکمل کر دیے اُس نے
بڑی مشکل سے ٹالے تھے یہ سر سے دھوپ کے بادل
کھڑے سر پر ہمارے پھر یہ بادل کر دیے اُس نے
یوں مہنگائی کی حاکم نے لگائی چھاپ ذہنوں پر
مری بستی کے سارے لوگ پاگل کر دیے اُس نے
امیر شہر صدیوں سے زباں بندی کا قائل تھا
محبت کے نگر پل بھر میں جنگل کر دیے اُس نے
ہمیں انمول رشتوں پر بڑا ہی ناز تھا گوہر
نہ جانے کیوں سبھی رستے یہ دلدل کر دیے اُس نے

چاہتوں کے راستے میں آبلے تو ہوتے ہیں
لمحہ لمحہ جان لیوا حادثے تو ہوتے ہیں
یہ الگ ہے کہ محبت لوٹنے دیتی نہیں
لوٹ آنے کے وگرنہ راستے تو ہوتے ہیں
ہم نہ کہتے تھے کہ پھر بھی اک ذرا سی احتیاط
دوستوں کے بھی عدو سے رابطے تو ہوتے ہیں
دل لگایا ہے تو دل میں دوریوں کا خوف کیوں
دو دلوں کے درمیاں بھی فاصلے تو ہوتے ہیں
اس لیے وہ مانگتے ہیں رنج و غم کی زندگی
درد میں بھی زندگی کے ذائقے تو ہوتے ہیں
کس طرح تم جیت جاتے قسمتوں کے کھیل میں
قسمتوں کے کھیل میں بھی دائرے تو ہوتے ہیں
جس قدر ممکن ہو گوہر مسکرانا چاہیے
زندگی کی بھیڑ میں یہ حادثے تو ہوتے ہیں

مجھے رہنے دیا جائے مرے دل کی حراست میں
مری انمول خوشیاں ہیں اسی شہر محبت میں
مرے الفاظ کی زد میں ہے اب بھی وقت کا حاکم
ہے اب بھی جان کا خطرہ مجھے میری ریاست میں
محبت کی زباں سے ہی تمہیں جنگ جیتنا ہوگی
عداوت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا بغاوت میں
سبھی رنج و الم اپنے مسلسل بھیجتے رہنا
کمی ہونے نہیں دینا کبھی اپنی سخاوت میں
مجھے خوابوں کی تعبیروں سے ڈر جانا نہیں آتا
مرا ہر خواب ہوتا ہے مرے رب کی حفاظت میں
وفاؤں میں شراکت کی اجازت ہم نہیں دیتے
خسارہ ہی خسارہ ہے سنا ہے اس تجارت میں
ہمیں بھی آ گئے گوہر ہنر کے پیچ و خم سارے
کیا ہے اک سفر ہم نے بھی لفظوں کی قیادت میں

حنا عنبرین/ڈیرہ غازی خاں

تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا
گلی کوچے نہیں بھاتے نگر اچھا نہیں لگتا
مجھے ہنسنا نہیں آتا، مجھے ساون نہیں بھاتا
سہانی شام کا منظر مجھے اچھا نہیں لگتا
مجھے کہنے نہیں دیتا میرے دل کی کئی باتیں
محبت تیری آنکھوں میں یہ ڈر اچھا نہیں لگتا
جب آدھی رات آتی ہے تمہاری یاد آتی ہے
شب فرقت ترا پہلا پہر اچھا نہیں لگتا
چلے جاؤ ان آنکھوں سے حسیں خوابو! حسیں لوگو!
ہوا کے سنگ خوشبو کا سفر اچھا نہیں لگتا
جدائی بھی سہیں گے ہم ابھی تنہا بھی رہ لیں گے
ترا یوں غیر سے ملنا مگر اچھا نہیں لگتا
وصالِ یار مانگا ہے، بصد اصرار مانگا ہے
فراقِ یار میں جینا اگر اچھا نہیں لگتا

تری گلی سے گزرنے کا اختیار ملا
ہر ایک شخص وہاں ہم کو بے قرار ملا
تمہارا قرب ملا، اور انتظار ملا
مثالِ غیر ملا اور بچھڑا یار ملا
میں چل رہی ہوں حوادث کی شاہراہوں پہ
مجھے وصال ملا، حالِ سازگار ملا
جو تیرے حُسن کو دیکھے بھی اور نہ بہکے بھی
تو ایسا شخص ملا ایسا شاہکار ملا
بتاؤ کِس نے سکھایا ہے یوں خفا رہنا
کہاں سے حُسن ملا حُسن کا خمار ملا
خزاں کی دھوپ نے پگھلا دیا ہے موم کا جسم
الٰہی پیار ملا، موسمِ بہار ملا

تری یاد دل سے لپٹ آئی ہے
مری شاعری میں سمٹ آئی ہے
ترا درد مجھ سے جھگڑتا رہا!!!!
مری رات آنکھوں میں کٹ آئی ہے
مرے کچے آنگن میں اُترا ہے چاند
نظر بوسہ دے کے پلٹ آئی ہے
وہ اُلفت سے دیکھا کیے ہیں مجھے
حیا میرے گالوں تلک آئی ہے
مرے باپ نے مجھ کو دی تھی دعا
زمیں سے چلی چُھو فلک آئی ہے
سزا آپ نے مجھ کو ہجرت کی دی
حنا میرے ہاتھوں سے چھٹ آئی ہے
سلگتی دوپہروں میں ٹھنڈی ہوا
رُخِ یار کی اِک جھلک آئی ہے
میں عہدِ جدائی سے دوچار ہوں
مری خوب قسمت چمک آئی ہے

میں سراپا سوال ہو جاؤں
تو سراپا جواب ہو جائے
آدمی درد کا مرکب ہے
زندگی نذرِ مال ہو جائے
اپنی آنکھیں جلا گیا کوئی
جیسے جینا محال ہو جائے
دوستی کانچ کا کھلونا ہے
بے مروّت ملال ہو جائے
میرے اندر تیرا زخم اُترے
ایسی میری مجال ہو جائے
تیری جنت کا راستہ جانوں
ایسا ظاہر کمال ہو جائے

نیند، بے خوابی، رتجگے عذاب
لمحہ لمحہ کمال ہو جائے
آرزوئیں تو سر نکالیں گی
بے حسی کا جو کال ہو جائے
رات لمبی ہے گہرا سناٹا
تیری جانب خیال ہو جائے

تم بھی مجھے دکھ دیتے ہو
تم بھی دنیا جیسے ہو!
تم تو میرے اپنے ہو
غیر بنے کیوں رہتے ہو
مجھ کو لگا تھا بدل گئے ہو
تم ویسے کے ویسے ہو
ہجر بہت تڑپاتا ہے
وصل کی صورت کیسے ہو؟
آنکھیں جل تھل رہتی ہیں
اشک کی صورت بہتے ہو
مجھ کو چھوڑو اپنی کہو؟
کیوں اتنا دُکھ سہتے ہو
کیسا حال بنا رکھا ہے
کیوں اُلجھے سے رہتے ہو
آنکھیں نیند سے خالی ہیں
تم آنکھوں میں رہتے ہو
کاش کسی دن لوٹ آؤ
کب سے آنے کا کہتے ہو
کیا میں تمہیں یاد آتی ہوں؟
کیا تم میرے اپنے ہو؟
دیکھو! کتنی تنہا ہوں
اب تو کہو تم میرے ہو......!

اسد عباس اسد/ خانیوال

کیا خبر کس کا راز کیا نکلے
اُنگلیاں مت اُٹھا فقیروں پر

کتنے پاگل ہیں کیا سمجھتے ہیں
لوگ خود کو خدا سمجھتے ہیں
بانٹ کر کچھ نوالے لوگوں میں
خود کو وہ دیوتا سمجھتے ہیں
اُن کے دامن پہ ہے لہو میرا
سب جنہیں پارسا سمجھتے ہیں
اپنے دل کی اداسیوں کا سبب
ہم تیری بددُعا سمجھتے ہیں
عشق میں زندگی لٹا دوں گا
عشق والے بھی کیا سمجھتے ہیں
زندگی ہم سے اس طرح نہ اُلجھ
ہم تجھے بے وفا سمجھتے ہیں
ہم کو حالات نے سکھایا ہے
ہم بھی کھوٹا کھرا سمجھتے ہیں
ہم دھڑکتے ہیں تیرے دل میں اسد
ہم تیری ہر ادا سمجھتے ہیں

وہ ستمگر تھا مگر کیسا کمال اُس نے کیا
ہجرتوں کی دھوپ میں میرا خیال اُس نے کیا
دیر تک میں سوچتا ہی رہ گیا اُس کا جواب
آنکھوں آنکھوں میں کوئی ایسا سوال اُس نے کیا
ان میری آنکھوں پہ برسی سنگ باری عشق کی
میں بتا سکتا نہیں میرا جو حال اُس نے کیا
میں زمیں کا دشت وہ بامِ فلک کا چاند ہے
ہے یہ اُس کا ظرف مجھ کو بے مثال اُس نے کیا
بخت کے لمحوں میں جس کو میں نے بخشا تھا عروج
بخت ڈھلتے ہی اسد مجھ پر زوال اُس نے کیا

صحرا میں جو آنکھیں ہیں تو دریا تیری صورت
کر دیتی ہے اکثر مجھے پیاسا تیری صورت
اک شام کے آنچل میں چھپا کر تمہیں جاناں
خواہش ہے کہ دیکھوں کبھی تنہا تیری صورت
کھلتے ہوئے چہروں کا اثاثہ تیری آنکھیں
بکھرے ہوئے لوگوں کا دلاسا تیری صورت
جب بھی کبھی کھولوں میں کتابِ غم ہجراں
ہر صفحے پہ تڑپاتی ہے کتنا تیری صورت
ہونٹوں پہ اسد ہیں تیرے قصے تیری باتیں
دل میں تری خوشبو، تیرا لہجہ، تیری صورت

اپنے دشمن کے تکبر کو جھکانا چاہیے
سر کٹا کر بھی سناں پر مسکرانا چاہیے
ڈس لیا کرتے ہیں اکثر سادگی سے رازداں
اپنے لوگوں سے بھی رازِ دل چھپانا چاہیے
آج میں تنہا سرِ مقتل کھڑا ہوں اس لیے
دے کے یاروں کو صدائیں آزمانا چاہیے
میری بربادی پہ وہ غمگین ہے میری طرح
اُس منافق شخص کو تو مسکرانا چاہیے
جانتا ہوں بے وجہ یوں روٹھنا تیرا اسد
بس تجھے مجھ سے بچھڑنے کا بہانہ چاہیے

گجرانوالہ میں مقیم نامور ادیب اور کالم نویس
ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کی شاہکار کتب

اندازِ زیاں اور (فکاہیہ کالموں کا مجموعہ)
دیارِ عشق (مزاحیہ مضامین)
قطرہ قطرہ دریا (نثرپارے)
اندر آنا منع ہے (کالموں کا انتخاب)
پانیوں کی سرزمین (16 ملکوں کا سفرنامہ)
A Step away from light
(Real Short Stories of Pakistani Society)
نقوشِ ہستی (نثرپارے)
حرف حرف حیرت (صوفیانہ اقوال)
ذرّہ ذرّہ کائنات (صوفیانہ اقوال)

نستعلیق مطبوعات
F-4 فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
اسلم کولسری

جاوید عباس جاوید/ بھکر

جنگل میں رقص کرتا اب مور بھی نہیں ہے
دل کو چرانے والا وہ چور بھی نہیں ہے
کمزور ہیں پتنگیں منہ زور ہیں ہوائیں
اور ہاتھ میں ہمارے کچھ ڈور بھی نہیں ہے
کہتا ہوں روز اب نہ دیکھوں گا اس کی جانب
پر کیا کروں کہ دل پر کچھ زور بھی نہیں ہے
سنسان ہے سٹیشن، ناپید ہیں مسافر
گاڑی کی گڑگڑاہٹ کا شور بھی نہیں ہے
دیکھیں تو ظلمتوں کا اک دور ہے مسلسل
سوچیں تو یہ اندھیرا کچھ گھور بھی نہیں ہے
اب میں بھی دل شکستہ، بے چین، مضمحل ہوں
ساجن کی اب وہ پہلی سی ٹور بھی نہیں ہے
محرومیوں کا اپنی جاوید غم نہ کرنا
درد و الم کی بدلی گھنگھور بھی نہیں ہے

کتنا حسیں نظارہ دیکھا ہے آج میں نے
رنگت کا استعارہ دیکھا ہے آج میں نے
نٹ کھٹ ہوا نے اس کا ملبوس کیا اُڑایا
اس کے بدن کا پارہ دیکھا ہے آج میں نے
گزرے دنوں میں جس نے دل کو چرالیا تھا
اس شخص کو دوبارہ دیکھا ہے آج میں نے
ہے جس کی جستجو میں تشنہ لبوں کا لشکر
دریا کا وہ کنارہ دیکھا ہے آج میں نے

میں اس کی آرزو میں معدوم ہو نہ جاؤں
تقدیر کا اشارہ دیکھا ہے آج میں نے
جاوید جو بظاہر صد منفعت رساں ہے
ایسا بھی اک خسارہ دیکھا ہے آج میں نے

میری بے چین آنکھوں میں اک ایسا شہر بستا ہے
نہیں ہیں بام و در جس کے دریچے ہیں نہ رستا ہے
میں اپنے دور کے اک شہر ناپرساں میں رہتا ہوں
جہاں پانی بہت مہنگا ہے لیکن خون سستا ہے
بڑے لوگوں نے بچوں پر کچھ ایسے ظلم ڈھائے ہیں
کہ اب اس شہر کا بچہ نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے
خدا اس شہر پر کوئی عذاب سخت نہ ڈالے
یہی احساس مجھ کو روز، عقرب بن کے ڈستا ہے

تیری صورت کو دیکھ کر جینا
تیرے ملنے کی آس پر جینا
آفتوں اور مصیبتوں کے ساتھ
کتنا مشکل ہے چشم تر جینا
صبح سے شام تک سفر کرنا
اور پھر غم میں رات بھر جینا
زندگی اک سراب لاحاصل
عمر بھر ہے اِدھر اُدھر جینا
موت کو اپنا ہم سفر جانو
خوب تر چاہتے ہو گر جینا
موت کی جستجو میں کیوں ہیں لوگ
اتنا آسان ہے اگر جینا

غزل

سہیلہ انعام صدیقی/ کراچی

منافقوں کے شہر میں، عداوتوں کے زہر میں
بدلنا ہے فضا کو اب خلوص و امن و مہر میں

نظر کو میری بھا گیا وہ ایک سادہ بات سے
وفا کی ہی اُمنگ ہے، یہ دل جلوں کے شہر میں

نہ ہم سفر نہ ہم نوا مگر مرا ہے مہرباں
وہی رفیق و رازداں حکایتوں کے قہر میں

رواں ہے بہتے پانی میں عجب سی قدرتِ خدا
کہ لمحہ لمحہ رونما ہے انقلاب نہر میں

ہے زیست اس مقام پر کہ ڈھونڈتی ہے خامشی
مرا وجود کھو گیا ہے دل خراش جہر میں

سہیلہ میرے پاس صرف نعمت خلوص ہے
محبتیں ہی بانٹتی ہوں میں نظامِ دہر میں

شاعری

ساعت پر کوئی پتا پڑی ہے
جو میرے گھر میں خاموشی بڑی ہے
نظر پر وار اوچھے پڑ رہے ہیں
نجانے آنکھ کس سے جا لڑی ہے
تمہاری نفرتوں کا کون سوچے
مجھے اپنی محبت کی پڑی ہے
ہماری منتظر ہے موت کب سے
مگر یہ زیست کی منزل کڑی ہے
اسی سے ہم "ساعت" دیکھتے ہیں
ہمارے پاس اندھے کی چھڑی ہے
زمیں کے سارے برتن بھر گئے ہیں
کہ حسبِ حال بھادوں کی جھڑی ہے
میں اس کے ساتھ اُٹھ جاؤں گا ثاقبؔ
مری دیوار سر ڈالے کھڑی ہے

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

دوستوں والا نہیں اُس کا رویہ مجھ سے
اب اُسے چھوڑ دوں یہ بھی نہیں ہوتا مجھ سے
زندگی ! تجھ سے میں کتنی ہی محبت کر لوں
ٹوٹ جائے گا بالآخر ترا رشتہ مجھ سے
نام دنیائے ادب میں ہے مرے شہر کا بھی
ایک سے ایک ہے شاعر یہاں اچھا مجھ سے
بے ضرر اتنا کیا اتنا کیا ہے خود کو
چڑیا جیسا بھی پرندہ نہیں ڈرتا مجھ سے

میں ترے نام کی تشہیر تھا کرنے والا
وقت نے چھین لیا میرا ارادہ مجھ سے
جھک کے ملتا ہے تو یہ بھی ہے بہت میرے لیے
مجھ سے قد کاٹھ میں اونچا مرا بیٹا مجھ سے
وقت کچھ اور بھی کٹ سکتا ہے خوش فہمی میں
حیلہ جو کر لے اگر پھر کوئی وعدہ مجھ سے
حاکمِ وقت سے اتنا کوئی کہہ دے جا کر
چھین لیتا ہے کوئی میرا نوالہ مجھ سے
حال میں نے بھی سنایا نہ اُسے دانستہ
بھول کر اُس نے بھی نصرت نہیں پوچھا مجھ سے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

ان گنت یوں تو خریدار ملے ہم نہ ملے
وہ جو یوسف تھے کئی بار ملے ہم نہ ملے
آج راہوں میں ملاقات ہوئی ہے اُن سے
آج وہ صورتِ دلدار ملے ہم نہ ملے
کون جانے کہ کہاں کھوئے تھے ہم محفل میں
کتنی رغبت سے ہمیں یار ملے ہم نہ ملے
ہم تو بس تیرے طلبگار رہے تیرے رہے
ہر طرف ہم کو طلبگار ملے ہم نہ ملے
وہ جو تنہائی میں ملنے سے گریزاں تھے ہمیں
آج وہ بر سرِ بازار ملے ہم نہ ملے
ہم بھی کوفے میں رہے ابن مظاہر کی طرح
ابن مرجانہ سے غدار ملے ہم نہ ملے

سوچتے رہتے ہیں ہم اپنی کہانی پہ اسدؔ
کھل کے ہر فرد کے کردار ملے ہم نہ ملے

اسد اعوان/ساہیوال

بے یقینی ہے بھرے شہر میں چلنا مشکل
ایسے حالات میں ہے گھر سے نکلنا مشکل
قعرِ دریا نے میرے پاؤں پکڑ رکھے ہیں
اتنی گہرائی سے ساحل پہ اُچھلنا مشکل
اُس تنک خو پہ اثر کچھ نہ ہوا رونے کا
حقیقت کے سامنے پتھر کا پگھلنا مشکل
یہ محبت ہے کہ اب تیرے جلو میں پیارے
چل پڑے ہیں تو کوئی رستہ بدلنا مشکل
بزمِ رنداں میں سرِ شام جو آ بیٹھے ہیں
ان فقیہانِ عبا پوش کا ٹلنا مشکل
ہم بھی برباد ہوئے ایک محبت کے لیے
ٹھیک کہتے ہیں جوانی میں سنبھلنا مشکل
میرے اندر جو چھپا بیٹھا ہے مدت سے اسدؔ
ایسے کافر کا مدینے سے نکلنا مشکل

اسد اعوان/ساہیوال

خود سے اجنبی ہوں میں
کیسا آدمی ہوں میں
دشمنوں میں گھر کے بھی
وقفِ دوستی ہوں میں

زر پرست دور میں
محو دل لگی ہوں میں
مجھ سے تو جدا نہ ہو
تیری زندگی ہوں میں
کون تھا خیال میں
اب جو روشنی ہوں میں
تو ستارا صبح کا
شام کی گھڑی ہوں میں
کون کہہ رہا ہے سن
تیری شاعری ہوں میں

واصف سجاد/ساہیوال

آج بھی شاہین ساتھ ہے میرے بچھڑے ہوئے اک ساتھ کا دکھ
دل میں آ کر بیٹھ گیا ہے ٹوٹی اُجڑی ذات کا دکھ
موت کو جیون جان کے شب بھر جاگنا ہے معمول مرا
شب بھر چنتی رہتی ہوں میں ہجر میں ڈوبی رات کا دکھ
خوشیوں کے پیراہن میں ملبوس ہیں یوں تو لوگ سبھی
کون بھلا کب جان سکا ہے حال کا اور حالات کا دکھ
اشکوں کو دریا کر ڈالا، پھر دریا کو بحر کیا
عشق نے آنکھ کو بخشا ہے اک ہجر بھری برسات کا دکھ
حاکم سے کیا پوچھیں ہم جو حال بھی ہے مخلوق کا اب
تنہا سورج جان سکا کب کہر میں لپٹی رات کا دکھ
جی چاہے اس چارہ گر کا حال کبھی میں جان سکوں
اس کو تو معلوم نہ ہوگا ہاتھ سے چھوٹے ہاتھ کا دکھ
میرے مولا اور کسی دکھ پر کیا تجھ سے شکوہ ہو
خود کو تنہا کر دیتا ہے عشق میں کھائی مات کا دکھ
چلتے چلتے وصل اچانک ہجر کی شام میں ڈھل جاتا ہے
تم کیا جانو کیا ہوتا ہے بات سے نکلی بات کا دکھ
میں نے اس کے کہنے پر تریاق سمجھ کر زہر پیا
اسی لیے تو بھول چکی شاہین میں آج حیات کا دکھ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ/ڈیرہ غازی خاں

کسی میں بھی نہ رہا ولولہ و اُمنگ یہاں
بنامِ امن سجائی گئی ہے جنگ یہاں
میں مفلسوں کا تعارف نہیں کراتا ہوں
نہ ان پہ اور ہو جائے زمین تنگ یہاں
ضرور ان میں کوئی وقت کا ستایا ہے
دھمال ڈالتے پھرتے ہیں جو ملنگ یہاں
نہ جس کو خوف حکومت نہ شاہ کا ڈر ہو
تو گونجتا ہے اُسی کا سخن دبنگ یہاں
ہمارے عہد میں تلوار چل نہیں سکتی
قلم ہی لے کے چلو اب تو سنگ سنگ یہاں
تمہارے ہاتھ میں کچھ تتلیاں سلامت ہیں
مگر اُڑا دیے ہیں تم نے ان کے رنگ یہاں
نہ اب لگاؤ توقع کسی بھی جگنو سے
یہ آفتاب کرے گا سبھی کو دنگ یہاں

آفتاب خان/لاہور

ادائے یوسفی رکھتا ہوں اکثر مار دیتا ہوں
انا مرنے نہیں دیتا میں ٹھوکر مار دیتا ہوں
مرے پیچھے جب آتا ہے کوئی شیطان بہکانے
درودِ پاک پڑھ کر ایک کنکر مار دیتا ہوں
تعلق ہے میاں میرا اُسی جنگجو قبیلے سے
نکل آیا تو پھر لشکر کے لشکر مار دیتا ہوں
اُسے کہنا مری یادوں میں مت آئے نکل جائے
اُسے کہنا میں یادوں کے کبوتر مار دیتا ہوں
مرے اندر بپھرتی ہیں اگر یہ ہجر کی موجیں
میں دریا ہوں انھیں پانی کے اندر مار دیتا ہوں
نہیں مرتا کسی بھی وار سے اُس کو پھر اکثر میں
محبت کی پہاڑی سے اُتر کر مار دیتا ہوں
نہیں میں مارتا ناحق کسی خوش شکل پیکر کو
مگر جب مارنا چاہوں وہ پیکر مار دیتا ہوں

راؤ وحید اسد/ملتان

لکھ کر ساری رام کہانی بھیجوں گا
کاغذ پر پانی ہی پانی بھیجوں گا
شاید اب وہ مجھ کو نہ پہچان سکے
میں اپنی تصویر پرانی بھیجوں گا
کھل جائیں گے سارے رستے محلوں کے
اب کے ایسی ایک نشانی بھیجوں گا
بھیجوں گا میں یاد کی چھتری تحفے میں
آنکھیں، بارش اور جوانی بھیجوں گا
کیسی کیسی قسمیں کھائیں تھی اُس نے
اگلے خط میں یاد دہانی بھیجوں گا
بھیجوں گا میں ڈھیروں اُس کو پیار اسدؔ
اور میٹھا لہجہ ملتانی بھیجوں گا

راؤ وحید اسدؔ/ملتان

شاعری

دُعا کو سبز موسم کی طلب ہے
مرے فن کو ترے غم کی طلب ہے
جہاں غم کے قدم پہنچے نہیں ہیں
ہمیں اک ایسے عالم کی طلب ہے
مجھے بھی ظرف اُس کا دیکھنا ہے
اُسے بھی رنج پیہم کی طلب ہے
وہ بستی ڈوب جائے گی یقیناً
جسے اک موج برہم کی طلب ہے
وہ صحرا تشنا کامی میں رہے گا
دُعا سے جس کو شبنم کی طلب ہے
وہ دیوانہ نہیں تو اور کیا ہے
جسے پتھر سے سرگم کی طلب ہے
سکوت وقت شاہد کہہ رہا ہے
اسے اب خوں کے قلزم کی طلب ہے

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

رُکتی نہیں ہے درد کی شدت کہاں چلیں
ہم ساکنانِ شہر محبت کہاں چلیں
موجِ سحر سے پوچھ لے یہ بھی نسیم صبح
بڑھ جائے جو فضا میں تمازت کہاں چلیں
ہر سمت گونجتی ہے صدا قتل کی مرے
ہر شخص کر رہا ہے بغاوت کہاں چلیں
اپنی نفس نفس ہے تہہ دامِ دل اسیر
ملتی نہیں رہائی کی صورت کہاں چلیں
ہم نے رفاقتوں میں جلائے وفا کے دیپ
اُن کو نہ ہو دعا کی ضرورت کہاں چلیں
کھلتے ہیں باغِ حسن میں اب خار جا بہ جا
روٹھی ہے بزمِ گل سے مروّت کہاں چلیں
حرص و ہوس کے دیس میں شاہد مرے بتا
تیرے جنوں میں آج ہے شدت کہاں چلیں

مشہود شاہد/چترال

دُریدہ لفظ پر مبنی کہانی مار ڈالے گی
شبِ غم ظلمتِ دل کی ویرانی مار ڈالے گی
ہمیں طغیانیوں میں ہجر کی بہنے ہی دو یارو
وگرنہ شہر کی ظالم جوانی مار ڈالے گی
زمانے کو کھٹکتے ہیں فسانے آج اُلفت کے
بہاروں کو چمن کی گل فشانی مار ڈالے گی
دمِ رُخصت تری پلکوں پہ کاجل بھیگ سا جانا
ترے ہجراں کی اکلوتی نشانی مار ڈالے گی
وفا میں کلفتیں آئیں گی لیکن حوصلہ رکھنا
تری اک بات یہ برسوں پرانی مار ڈالے گی
مری دھرتی کو بھی دے دو وہی قانون جنگل کا
ہمیں ان رہزنوں کی پاسبانی مار ڈالے گی
کسی دن دشتِ غم میں دل جلوں کی خاک پا ہوگی
کسی دن آرزو کی کھینچا تانی مار ڈالے گی
صبا کی آنچ پر اکثر ہی جلتے پھول دیکھے ہیں
گلوں کو گل دلوں کی قدردانی مار ڈالے گی
جو تم چپ چاپ رہتے ہو، گلوں کو بیچ گلشن کے
مرے شاہد تری یہ بے زبانی مار ڈالے گی

مشہود شاہد/چترال

لے کے جس کی ہیں جستجو آئے
یہ دعا ہے وہ روبرو آئے
دل کا یہ حال اُس پہ مرتا ہے
راہ میں کتنے خوبرو آئے
وہ نہ بولے یہ اُس کی مرضی ہے
کان تک اُس کی گفتگو آئے
مجھ کو مل جائے زندگی کی خوشی
میرے گھر میں کبھی جو تو آئے
تیرے لب پر سدا ہو ذکر خدا
دل سے بھی تیرے اللہ ہو آئے
یہ مقام خلوص ہے ساقی
جو بھی آئے وہ باوضو آئے
کہہ دو بالم جہان والوں سے
عشق میں ہم بھی سرخرو آئے

محمد اقبال بالم/بھکر

کر یونہی مے کشی رہا ہوں میں
جام یادوں کے پی رہا ہوں میں
اب کبھی نام تیرا لے نہ سکیں
اپنے ہونٹوں کو سی رہا ہوں میں
اس قدر بھی نہ بدلحاظی کر
تیرا دلبر کبھی رہا ہوں میں
کچھ نہیں درد کے سوا یارو!
عشق نے ہر گئی رہا ہوں میں

شاعری

میری عاشق تھی ہر حسیں تتلی
شبنمی پھول بھی رہا ہوں میں
بے وفا دیکھ حوصلہ بھی مرا
بن تمہارے بھی جی رہا ہوں میں
سوچتا ہوں کہ بے وفا سے سعید
کرتا کیوں عاشقی رہا ہوں میں

سعید محمد سعید/لاہور

ذرا سنو تو

ادھورے بختوں کے کتنے نوحے
نمک میں لتھڑے
ہمارے فردا پہ ہنس رہے ہیں
یہ ہم جو اپنے نگار خانوں میں
خواہشوں کی کہانیوں کے گناہ اوڑھے سسک رہے ہیں
یہ ہم وہ کردار تھے مری جاں......!
کہ جن میں ڈھل کر
تمہارے ہونٹوں سے نقطہ نقطہ ٹپکتے گرتے حروف سارے
مکالموں کے تبادلوں میں......اُلجھ پڑے ہیں
حروف سارے......کہ جن کے ابلاغ
پچھلی صدیوں کی کوکھ سے پھوٹتے زمانوں کی
سرسراہٹ میں کھو گئے ہیں
ذرا سنو تو......یہ حرف سارے ہمارے فردا پہ
ہنس رہے ہیں
مگر سنو تو......!
پرانی صدیوں کی کوکھ سے پھوٹتے زمانوں کی سسکیوں میں
حیات لو ہے......
تمہیں بھی رو لیتے......اے محبت
کہ اک ذرا سے جو رہ گئی ہے......
تمہاری لو ہے......!!

حامد ظہور

عشق ہمارا پیشہ ہے

دیکھو!
ہم تو قبروں والے لوگ تھے
دل کی باتیں جانتے تھے اور غیب کا علم بھی رکھتے تھے
عشق ہمارا ورثہ تھا
اور عشق میں ہم......مجاز کی سرحد سے کچھ آگے
اور حقیقت سے بس چار قدم ہی پیچھے
تیری آنکھ کی اک جنبش......اور
تیرے ہونٹ کی اک لرزش پر اٹکے تھے
گویا ایک نفی اثبات کا پل تھا......جس پر
ہم یہ قبروں والے لوگ
آنکھ اُٹھے تو ہنستے تھے اور ہونٹ ہلیں تو روتے تھے
حرف ہمارے ہاتھ کی پوروں کی چھاتی سے
قطرہ قطرہ......
ماں کے پہلے دودھ کی مانند بہتے تھے......ہم کہتے تھے
یہ حرف ہمارے، پاک پوتر ہیں، اُجلے ہیں......اور
ان حرفوں سے جڑتی بنتی ہر اک بات بھی اُجلی ہے، پر
عشق ہمارا پیشہ ہے......اور عشق کے ابجد خواں ہیں ہم
اس عشق کی ابجد خوانی میں
ہم جو سیکھیں، ہم جو سوچیں اور جو لکھیں، سب تیرا ہے

ہم یہ قبروں والے لوگ تو غیب کا علم بھی جانتے تھے
سو جانتے ہیں ہم......
تیری آنکھیں روشن ہیں......پر اِن میں ہمارے
اُجلے حرف تو
سورج بن بن ڈوبتے ہیں
تم کیا جانو......
یہ حرف نہیں......ہم ڈوبتے ہیں......
اور اُجلے اُجلے حرف ہمارے نوحے بنتے جاتے ہیں
سو ان نوحوں کے بوجھ تلے ہم
تیری سبز، سنہری یادوں سی آیات میں لپٹے سے
یہ قبروں والے
پھر سے اپنی قبروں میں جا سوئے ہیں......!!

حامد ظہور

کب تک

اُڑیں گے ریزے جسموں کے فضاؤں میں بھلا کب تک
مرے پھولوں کی خوشبو کو چرائے گی قضا کب تک
سے کے حاکمو تم سے مجھے یہ پوچھنا ہے بس
وطن میں رہنے والوں کی حفاظت کس کو کرنی ہے
چنیں گے ہم بھلا کب تک جگر گوشوں کے ٹکڑوں کو
ہمیں یہ رسم کربل کی بھلا کب تک نبھانی ہے
ہوس کی قید سے خود کو کرو گے تم رہا کب تک

اُڑیں گے ریزے جسموں کے فضاؤں میں بھلا کب تک
مرے پھولوں کی خوشبو کو چرائے گی فضا کب تک
کریں گی وحشتیں کب تک کلیجے ماؤں کے چھلنی
کہاں تک روئیں گے آخر یہ باپ اپنے سہاروں کو
بہائیں گی بھلا کب تک لہو آنکھیں یہ بہنوں کی
بھلا دفنائیں گے کب تک یوں بھائی اپنی بہنوں کو
یہ ناحق خون بہنے کا رہے گا سلسلہ کب تک
اُڑیں گے ریزے جسموں کے فضاؤں میں بھلا کب تک
مرے پھولوں کی خوشبو کو چرائے گی فضا کب تک
تسلی کب تلک دو گے سہارا جھوٹ کا لے کر
کہاں تک کھائیں ہم غوطے اُمیدوں کے سمندر میں
ستمگر کب تلک رُسوا کریں گے پاک دھرتی کو
رہے گی زندگی کب تک ہماری خوف کے گھر میں
سکوں لینے نہیں دے گی یہ ان دیکھی بلا کب تک
اُڑیں گے ریزے جسموں کے فضاؤں میں بھلا کب تک
مرے پھولوں کی خوشبو کو چرائے گی فضا کب تک
تمہارے گھر میں ماتم ہو تو پھر احساس ہو تم کو
کہ جن کے پیارے مر جائیں وہ کیسے سانس لیتے ہیں
انھیں کیوں خوں رُلاتے ہیں کبھی موسم کبھی منظر
وہ جیتے جی کبھی خوشیوں کو کیوں بنواس دیتے ہیں
رہے گی بے ثمر آخر ہماری التجا کب تک
اُڑیں گے ریزے جسموں کے فضاؤں میں بھلا کب تک
مرے پھولوں کی خوشبو کو چرائے گی فضا کب تک
سلیم اپنے لہو سے آج میں تحریر کرتا ہوں
علم ہاتھوں میں لے کر اب وہی عشاق نکلیں گے
مٹائیں گے وطن سے جو نشاں وحشی درندوں کا
ہمارے خوف کو جذبوں کی جو تصویر کر دیں گے
پسے گی ظلم چکی میں بھلا خلقِ خدا کب تک
اُڑیں گے ریزے جسموں کے فضاؤں میں بھلا کب تک
مرے پھولوں کی خوشبو کو چرائے گی فضا کب تک

عمران سلیم/لاہور

اپنی بیٹی مائدہ زینب کے لیے

یہ زینب کی دعا کا معجزہ ہے
ہماری مائدہ کا گھر بسا ہے
بہشتوں میں بسا ہے اُس کا دادا
وہیں سے وہ دعائیں بھیجتا ہے
مرے گھر پر ہجومِ دوستاں میں
محبت کا فرشتہ بھی کھڑا ہے
خدا کی رحمتوں سے استفادہ
جو میں نے آج تک جی بھر کیا ہے
یہ میری بیٹیوں کی برکتیں ہیں
مرا دامن کرم سے بھر گیا ہے
مرے مولا اسے آباد رکھنا
محافظ تو، تو سب کی جان کا ہے
ملیں خوشیاں ہی خوشیاں دو جہاں میں
یہی ادریس کے دل کی دُعا ہے

محمد ادریس لاہوری/ناروے

کوئی اپنا

گلاب رُت تھی بہار موسم
نئے شگوفے چٹک رہے تھے
چمن میں ہر سو کھلی تھیں کلیاں
ہوا میں خوشبو گھلی ہوئی تھی
دفورِ اُلفت کا دن منانے
وفا کا اپنی یقیں دلانے
یہ پھول بوئے چمن کے سارے
قطار باندھے کھڑے ہوئے تھے
قافلے رنگ و بو کے شاداں
جوق در جوق چل پڑے تھے
فضا کی دیوی بھی پھول تھامے
وفا نبھانے کو آ گئی تھی
کوئی اپنا چلا گیا تھا
قضا کا جھونکا وفا کے پتلے کو
لمحہ بھر میں ہی لے اُڑا تھا
یہی وہ دن تھے یہی وہ رُت تھی
جب وہ ہم سے جدا ہوا تھا

تسنیم کوثر

برگد پہ محوِ خواب ہیں سو رنگ کے طیور
آہستہ بول پنکھ نہ لگ جائیں رات کو

بیدل حیدری

شام وسحر کے درمیاں

رئیس عباس زیدی

پنجاب یونیورسٹی اورانگریزی ادب

پروفیسر سراج الدین مرحوم نے پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے ایم اے میں داخلہ دے دیا۔ یہ سال ۱۹۷۰ء تھا۔ سینئر کلاسز کے بنگالی لڑکے واسکٹیں اور سفید براق، کرتے پاجامے پہنے بڑی سنجیدگی سے کتابیں اُٹھائے لائبریری آتے جاتے دکھائی دیتے۔ پنجاب یونیورسٹی کا شعبہ انگریزی ادب اولڈ کیمپس میں واقع تھا۔ سب لائبریریاں شہر میں تھیں۔ برٹش کونسل، امریکن سنٹر، دیال سنگھ کالج لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کی اپنی لائبریری لہٰذا مجیٹھیا ہال میں کمرہ لیا گیا۔ یہ ہال سردار سندر سنگھ مجیٹھیا نے بنوایا تھا۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ اولڈ کیمپس میں ہونے کی وجہ سے یہ ہاسٹل ٹھہرا۔ کمرہ نمبر ۷۱ تاحیات یادرہے گا کہ وہاں میں نے خواب دیکھے اور پھر خواب پورے کیے۔ ہوسٹل میں ایک ماہ کے لیے ایک طالب علم میس سیکرٹری بنتا ہے اُس مہینے اُس کے ذمہ کھانے کا انتظام وانصرام ہوتا ہے۔ ایک شام کھانا کھانے میس بیٹھے تو تندور کی گرم گرم روٹیوں کے ساتھ پلیٹ میں دو دو بوٹیاں، شوربہ اور تین تین چھوارے پڑے تھے۔ اُس دن سے کیمیکل ٹیکنالوجی ڈیپارٹمنٹ کے اُن چوہدری صاحب کا نام ''چوہدری چھوارا'' پڑ گیا۔ نام احتیاطاً نہیں لکھ رہا کہ موصوف آج کل ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔

ایک دن شکر دوپہرے ہم دونوں ہوسٹل کے باہر سیمنٹ کی بُرجیوں پر بیٹھے تھے ایک ریچھ والے کا وہاں سے گزر ہوا۔

''اوئے ہُن تک کِنے پیسے کمائے نیں؟''

چودھری صاحب نے پوچھا۔

ریچھ والے نے کچھ روپے اور کچھ پیسے بتائے۔ چودھری صاحب نے وہ قوی الجثہ ریچھ بمع اسٹک کے اُس سے لے لیا۔ اب ہم ہر کمرے میں جاتے ریچھ کو کرسی پر بٹھاتے اُس کمرے کے رہائشی طالب کو کہتے تمہارا مہمان آیا ہے اس کی خدمت کرو۔ پیسٹریاں، شیزان کی بوتل یا پانچ روپے نقد۔ ایک سو کمروں میں سے کچھ بند تھے۔ باقی میں ریچھ کی خوب خدمت ہوئی۔ کوئی اڑتالیس روپے اور کچھ پیسے اکٹھے ہوئے۔ یہ پیسے اور ریچھ، ریچھ والے کے حوالے کیے گئے۔ وہ دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ یادرہے یہ ۱۹۷۰ء ہے اور یہ رقم خاصی ہوتی تھی۔

فائنل ایئر اور ففتھ ایئر کی بعض اوقات کلاسز اکٹھی ہوتیں۔ اِن ہم جماعتوں میں کچھ ہم جماعت خاصے اہم لوگ بنے۔

سلمان صدیق، صبیحہ منصور، نیلم علی سلیمان غنی، طارق قریشی ۳۰ سال بعد کے ایئر کموڈور قریشی، میجر جنرل طاہر، بدر السلام، مرزا محمد علی، بشریٰ اعتزاز، اعتزاز احسن بھی اکثر وہیں گھومتے نظر آتے۔ سلمان صدیق سنہرے بالوں والے اپالو دیوتا کے بال ہمارے دیکھتے دیکھتے چٹے سفید ہوگئے۔

شہریار راشد شاعری بھی کرتے اور شام کو جیوجتسو۔ سکھاتے۔ ہم جماعت اور ہونے والی بھابھی عفت نذیر کو دیکھ کر ہماری نگاہیں احتراماً جھک جاتیں۔ نوید شہزاد ڈرامہ اور شاعری پڑھاتیں۔ کبھی کبھی شعیب ہاشمی بھی ڈرامہ پر لیکچر دینے آجاتے۔

جہانگیر بدر نے الیکشن لڑا۔ حفیظ خان جیت گیا۔ مبینہ دھاندلی کا الزام اور ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔

پروفیسر سراج صاحب مرحوم کو ہم ایک سحر انگیز اُستاد اور خوبصورت گفتگو اور لیکچر دینے والے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اُن کی ۱۹۵۵ء ماڈل کی ''واکس ہال'' جس کے تاروں والے ٹائر تھے۔ جب اُن کی گاڑی اولڈ کیمپس پہنچتی تو بہت سارے کتے کہیں سے آ جاتے اور وہ اپنی گاڑی سے لفافے نکال نکال کر کھانا ڈالتے۔ جاتے۔ طلباء اُن کا سحر انگیز لیکچر کبھی بھی مس نہ کرتے۔ الیکشن والے دن اُن کے کردار کا ایک پہلو سامنے آیا۔ طلباء کا ایک ہجوم بیلٹ بکس اُٹھانے کے لیے کھڑا ہے اور آپ فرما رہے ہیں:

''مجھے اُٹھا کر لے جاؤ۔ بیلٹ بکس نہیں اُٹھانے دوں گا۔''

ہجوم شرمندہ شرمندہ سا واپس چلا گیا۔ ایسے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

فرخ ہارون رشید کے گھر ایک پارٹی میں ہماری ایک کلاس فیلو ایک بہت ہی خوبصورت سہیلی کو ساتھ لے آئی۔ پروفیسر سراج صاحب انگلش ڈیپارٹمنٹ سے کنٹریکٹ کی میعاد پوری ہونے پر ریٹائر ہو رہے تھے۔ شاید یہ اُن کی الوداعی پارٹی تھی۔ مرحوم اُس خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''تم بہت خوبصورت ہو مجھ سے شادی کرلو......

اچھا میں بہت بوڑھا ہوں۔ مجھ سے نہیں تو میرے بیٹے سے شادی کرلو۔ وہ لندن میں رہتا ہے اور والدین

"بہت اچھا بجاتا ہے۔" وہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی اور ساری شام پروفیسر سراج صاحب مرحوم کے ساتھ بیٹھی رہی۔

تقریباً سب لوگ اچھے اداروں سے پڑھ کر آئے تھے۔ ایچی سن کالج، گورنمنٹ کالج لاہور، لڑکیاں لاہور کالج اور کنیرڈ سے۔ چند ہم جیسے مضافات کے کالجوں سے آئے تھے۔ سنڈریلا کی طرح ایک جوتا پکڑے دوسرے جوتے کی تلاش میں۔ شرمیلے، مڈل کلاسیے، کوئی پسند آ گیا تو پورے اڑھائی سال اسے کہا نہ گیا۔ بعد میں ایسی شرم اتری کہ کوئی ذرا سا اچھا لگا تو فوراً خوبصورت ڈائیلاگ تیار لیکن اُس پہلی شکست کا مداوا کبھی نہ ہوا۔

یہ خوبصورت دن خواب کی طرح گزر گئے۔

مشرقی پاکستان میں آپریشن شروع ہو گیا۔ جنرل ٹکا خان نے الاہرام کے ایڈیٹر حسنین ہیکل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا "تاریخ نے مجھے ایک رول دیا ہے اور تاریخ ہمیشہ ایک بری ڈائریکٹر ہوتی ہے۔"

بے تحاشہ خون بہا، یونیورسٹی میں نظر آنے والے متین، سنجیدہ متفکر کتابیں اُٹھائے پھرنے والے بنگالی طلباء واپس چلے گئے۔

ٹائیگر نیازی کہتا رہا کہ ڈھاکہ اُس کی لاش پر فال کرے گا لیکن ۱۶ دسمبر کی شام ۵ بجے ریڈیو پر یہ خبر سن کر ہم سب دوست پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ قائداعظم کا پاکستان تاریخ کے پیمانوں کے حساب سے بہت جلد ٹوٹ گیا۔ چند دہائیاں ملکوں اور قوموں کی زندگی میں اتنی زیادہ نہیں ہوا کرتیں۔

بغیر نصاب دیکھے ایم اے اُردو کا امتحان دے دیا۔ تقریباً فرسٹ ڈویژن آ گئی۔ نوکری کی فکر ہوئی۔

بے روزگاری کے چند ماہ اتنے ہنس مکھ بے فکرے اور مخلص دوستوں کے گروپ کے ساتھ، کتابوں کے ساتھ گزرے۔ ٹالسٹائی کی وار اینڈ پیس، بورس پیسرناک کی ڈاکٹر ژواگو۔ ٹیگور کی گیتا نجلی اُسی زمانے میں ختم کی۔

محبت نا جنس

یونائیٹڈ بنک اُس وقت آغا حسن عابدی جیسے بینکنگ جینئس کے سائے تلے پھل پھول رہا تھا۔ پروگریسو بینکنگ کے نام پر اس بینک میں سب کچھ جائز تھا۔ فیصل آباد میں تحریری امتحان اور انٹرویو ہوا۔ راقم الحروف کو گریڈ ٹو افسر رکھ لیا گیا۔ چناب ایکسپریس پر کراچی پہنچے۔ اسٹیشن پر کوثی نے استقبال کیا۔ ماموں لیفٹننٹ جنرل سہیل عباس جعفری اُن دنوں میجر تھے اور ہندوستان میں ساگر کیمپ میں جنگی قیدی تھے۔ اُن کے بچوں کے ساتھ دل لگا لیا۔ بنک نے پی ای سی ایچ ایس میں ایک کوٹھی بنام "لالہ زار" کرایے پر لے رکھی تھی۔ اس میں ہوسٹل تھا۔

سٹاف کالج چیل کوٹھی کے پاس تھا۔ عقیل حیدر نقوی مرحوم، شاہد علی، شیخ وقار، عتیق الرحمٰن صاحب بڑا ہنس مکھ اور خوبصورت گروپ بن گیا۔

دن بھر سٹاف کالج میں بینکنگ سیکھتے اور برانچوں میں یکسانیت سے بھرپور بور کام سیکھتے، شام کو طارق روڈ کا خیر سگالی چکر اور رات کو پلاسٹک کی بالٹی بجا کر گاتے۔ سب اپنے گھروں سے دُور تھے۔ ملتان سے وقار کی والدہ کے انتقال کی خبر آئی اور ہم سب پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ پڑوس سے ایک گریس فل سی عمر رسیدہ خاتون ہمیں دلاسہ دینے کے لیے آئیں:

"بچو! روزانہ تمہارے گانے کی آوازیں آتی تھیں آج تم پر کیا گزری؟"

زندگی میں غم اور خوشی، المیہ اور طربیہ یوں خلط ملط ہیں۔ ان کی سرحدیں یوں مدغم ہیں کہ پتہ نہیں چلتا خوشی کہاں ختم ہوئی اور غم کہاں شروع ہوا۔ انسان تمام زندگی اس پیچیدہ دوراہے پر چلتا چلا جاتا ہے۔ خوشی کے مختصر لمحوں پر سفر کرتے ہوئے جانے کس وقت غم کی لینڈ مائن پر پاؤں جا پڑے کوئی نہیں جانتا۔ غالب نے کہا تھا کہ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح دُکھوں کے غموں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں خوشی کے لمحے اچانک یوں آ جاتے ہیں جیسے آپ افسردہ بیٹھے ہوں اور کوئی ننھا منا پیارا سا معصوم بچہ دروازہ ہٹا کر "جھات!" کہہ دے اور آپ کی تاریکیاں اُس معصوم حرکت پر چاند کی کرنوں اور قوس قزح کے رنگوں کی طرح جگمگا اُٹھیں۔ جب دُکھ گھیر لیں تو خوشیاں کہیں قریب ہی ہوتی ہیں۔ شیلے نے کہا تھا "جب خزاں آتی ہے تو بہار دُور نہیں رہ جاتی"

بنک کی جمودی زندگی سے خوش نہیں تھا۔ روزانہ وہی کام، وہی یکسانیت، سیکنڈ افسر لبرٹی مارکیٹ برانچ والا مختصر سا عرصہ کچھ دلچسپ تھا۔ تقریباً سب اداکاروں اور ایکٹرسوں کے اکاؤنٹ وہاں تھے۔ روزینہ ڈیفالٹر تھی۔ فرزانہ ندیم کا لاکر تھا۔ اسد بخاری تقریباً روزانہ آتے۔ زرقا مرحومہ کا بھی ایک اکاؤنٹ تھا۔ منیجر صاحب پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔ اپنی زبان بولتے۔ سلامت چپڑاسی جنگ عظیم دوم میں برما کے محاذ پر رہ آیا تھا۔ اُس کا ہر واقعہ کسی طرح برما کے محاذ سے شروع ہوتا۔

ایک دن تنگ آ کر پوچھا "سلامت! تم نے برما کے محاذ پر کتنے جاپانی مارے تھے؟"

"ہم کیوں مارے جاپانی ہم تو سپلائی میں تھے۔" جواب ملا۔

شاعری

یہ چشم نم تو مرا آخری سہارا ہے
کہ جس نے عکس ترا قلب میں اُتارا ہے
تھا جو شورِ قیامت تو آئی یاد تری
کہاں سے بادِ صبا نے ہمیں پکارا ہے
نہ کوئی دوست شناسا نہ چاہنے والا
یہ کس نے بکھرا ہوا گھر مرا سنوارا ہے
شبِ سیاہ میں صورت تری کھلی ہم پر
چراغ تھام کے جانا کہ تو ستارا ہے
وہ تیرے خواب کی دنیا نے ہم کو مار دیا
تمام عمر لگا تو فقط ہمارا ہے
بھنور سمجھ کے جسے تو جمال بچ کے چلا
رُکی نظر تو کھلا کہ یہی کنارا ہے

سعید جمال

نگاہِ فقر نے کیسا بنا دیا مجھ کو
صلیبِ خار پہ کیونکر چڑھا دیا مجھ کو
کہا جو کن تو ہوا لامکاں پہ کون مکیں
وہاں بھی پردہ نشیں نے بٹھا دیا مجھ کو
بنا کے یکتا حسیں نام دے دیا آدم
مقامِ عشق پہ لا کر بھلا دیا مجھ کو
میں زیرِ تیشۂ فرہاد ایک پتھر تھا
دکھا کے چہرۂ شیریں رُلا دیا مجھ کو
وہ تیرے عرش میسر تھا، سجدۂ نوری
زمیں پہ شکلِ بتاں کیوں سجا دیا مجھ کو
شراب پی کے پڑا تھا دیارِ کعبہ میں
سمجھ کے میت کافر جلا دیا مجھ کو
وہ عکسِ نور پہ کامل ہے پیکرِ خاکی
خدایا تو نے یہ کیسا خدا دیا مجھ کو
ازل کی پہلی کہانی وہ رازِ خلدِ بریں
جمال واقعہ کیونکر سنا دیا مجھ کو

سعید جمال

اے خدا! فاقہ کشوں پر مہربانی کیجیے
رزق کی تقسیم پر کچھ نظرثانی کیجیے
اے خدا! دنیا میں ہم مہمان ہیں دو چار دن
اپنے مہمانوں کی کچھ تو میزبانی کیجیے
بے یقیں جھولی میں بھر کے کچھ یقیں کی روٹیاں
دور مفلس کے شکم کی بدگمانی کیجیے
خودکشی کرلی ہے پھر اک ماں نے سب بچوں سمیت
جا کے بھوکی میتوں پر گل فشانی کیجیے
زیست کے زندان میں اب کوئی بھی زندہ نہیں
آپ قبرستان پر اب حکمرانی کیجیے
عمر بھر قرآں سے جو اک خاص دوری پر رہا
اُس کی بخشش کے لیے قرآن خوانی کیجیے
رو رہا ہے رفتگاں کی یاد میں بوڑھا شجر
پاس اُس کے بیٹھ کر باتیں پرانی کیجیے
بیٹھ کر ساحل پہ لکھیے داستانِ تشنگی
اور بہتے پانیوں کو پانی پانی کیجیے
آپ کے منہ میں بھی سونے کی زباں موجود ہے
آپ بھی اہلِ زباں سے بدزبانی کیجیے
کارگر زورِ قلم سے زورِ بازو ہے یہاں
چھوڑ کر فکرِ سخن اب پہلوانی کیجیے
دفن کر کے قبر میں قرطاس کی الفاظ کو
اپنے زندہ شعر واصف آنجہانی کیجیے

جبار واصف/رحیم یار خاں

صبح درویش کروں شام قلندر کر دوں
تو کہے تو تیری دنیا کو مسخر کر دوں
کیا ضروری ہے کہ ہر چیز فنا ہو جائے
کیا ضروری ہے کہ ہر خواب کو منظر کر دوں
کمتری کا کوئی احساس نہ رہ جائے کہیں
آ تجھے اپنی محبت میں برابر کر دوں
جی میں آتا ہے کہ اب تجھ سے تجھے ملواؤں
جی میں آتا ہے کہ اب روح کو پیکر کر دوں
میں کہ تخریب پہ معمور نہیں ہوں ورنہ
دشت کو گھور کے دیکھوں تو سمندر کر دوں

شجاع شاذ/سیالکوٹ

اب دیے سے کہو کہ تھک جائے
کچھ نہیں تو ہوا کا شک جائے
آ مجھے قتل کر کہ میرے عدو
تیری تلوار بھی چمک جائے
عمر بھر کی فرشتگی سے کہو
لمحہ بھر ہی سہی بہک جائے
مجھ پہ پھل پھول تک نہیں اُگتے
میں تو وہ پیڑ ہوں جو پک جائے
دشت آباد اس لیے کیا تھا
یہ مرے خون سے مہک جائے
اس قدر مجھ میں سبزہ بھر فاخر
گوشہ گوشہ مرا لہک جائے

فاخر رضوی/جرمنی

آسماں پر اک ستارا کھو گیا
اور ادھر رستہ تمہارا کھو گیا

شاعری

ڈھونڈتی پھرتی ہوں گلیوں میں اُسے
جو مجھے جاں سے تھا پیارا کھو گیا
یہ عجب رستہ ہے تیرے عشق کا
دل اِدھر سے جب گزارا کھو گیا
جو ملا تھا ہم کو اتنی دیر بعد
دو قدم چل کر دوبارا کھو گیا
لے گئی اک موج ہم کو اپنے ساتھ
ہاتھ میں آ کر کنارا کھو گیا

سعدیہ صفدر سعدی/شیخوپورہ

مزاج اپنا نہیں ملتا کسی سے
گلہ کیا کم نگاہی کا کسی سے
خمیر ہر شخص کا ہے ایک لیکن
کوئی نسبت نہیں رکھتا کسی سے
کوئی مشتاق ہے تنہائیوں کا
بسر ہوتی نہیں تنہا کسی سے
خوشی نے غم سے سمجھوتہ کیا جب
سہارا پھر نہیں چاہا کسی سے
اگر چاہو رہے قائم محبت
تو ملتے کم سے کم رہنا کسی سے
دعا مانگی عطش نے زندگی کی
کیا جب وعدۂ فردا کسی سے

منظور عطش/اوبیرو سندھ

اپنی ہی ذات کو خود سے بھی جدا رکھا ہے
بس ترے درد کو سینے سے لگا رکھا ہے
تیری صورت کا گماں اس پہ گزرتا ہے مجھے
اس لیے چاند کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے
تیرے خوابوں میں کہیں دور چلی جاتی ہوں
اب مسافت کے سوا نیند میں کیا رکھا ہے
تو نہ اِترا کہ مرا ہجر کٹھن گزرے گا
اُس نے بھی ضبطِ جنوں اپنا بڑھا رکھا ہے
تیری آہٹ تری دستک جو نہ آئی اب تک
دل کا دروازہ تو مریم نے کھلا رکھا ہے

مریم رانا/لاہور

خیالوں کے جہانوں سے نکل جائیں تو اچھا ہے
زمین و آسمانوں سے نکل جائیں تو اچھا ہے
ہمارا سامنا ہو جائے گا یوں سامنے سب کے
صنم جھوٹے بہانوں سے نکل جائیں تو اچھا ہے
میں ماضی کے رقیبوں سے اُلجھ جاتا ہوں اکثر ہی
ہماری داستانوں سے نکل جائیں تو اچھا ہے
مری اماں یہ کہتی تھی بہت سیلاب آتے ہیں
اگر کچے مکانوں سے نکل جائیں تے اچھا ہے
سکولوں میں نہیں جاتے سکولوں کے قریں رہ کر
یہ بچے کارخانوں سے نکل جائیں تو اچھا ہے
برے حالات میں کہتے ہیں ماضی کے خدا تھے ہم
جو ہم گزرے زمانوں سے نکل جائیں تو اچھا ہے

محمد ابصار/لاہور

زندگی کیا تری حقیقت ہے
خواب ہے یا کوئی حقیقت ہے
وہ تری گفتگو تھی افسانہ
یہ مری خامشی حقیقت ہے
تم نہ تھے میں وہاں اکیلا تھا
بس یہی خواب کی حقیقت ہے
تم اسے مانتے نہیں لیکن
میری لاحاصلی حقیقت ہے
جو مرے سامنے نہیں آیا
جانتا ہوں وہی حقیقت ہے
ایک مدت میں یہ کھلا مجھ پر
روشنی اک بڑی حقیقت ہے
زندگی کی حقیقتوں میں ثمن
ایک تیری کمی حقیقت ہے

مدثر ثمن

کہنے کو کہہ رہے ہیں کہ کہنے کو کچھ نہیں
کہتے ہیں ہم جناب کے سہنے کو کچھ نہیں
بستی کے اس نظام کے ہونے کی خیر ہو
ہونا یہاں ہے سب کو کہ ہونے کو کچھ نہیں
ایسے بھی لوگ ہیں کبھی سڑکوں پہ جا کے دیکھ
زندہ رہیں تو کیا ہے کہ مرنے کو کچھ نہیں
گر ہیں تو کوئی کھول دے ان کے وجود کی
رہتے ہیں اس طرح سے کہ رہنے کو کچھ نہیں
کشکول معرفت کا لیے ہاتھ میں عمر
سوچوں میں ہیں حضور کہ "کرنے" کو کچھ نہیں

احمد عمر ایاز

مجھ کو باہر سے بھی دستک دیتا ہے
یہ جو دل سا میرے اندر رہتا ہے
پوچھی تو نے وجہ چشم گریہ کی
یہ دریا تو یاد میں اُس کی بہتا ہے
کاٹ دیا آنگن کے پیڑ کو جس دن سے
گھر برہم ہے، پنچھی پنچھی رہتا ہے

شاعری

دل کو دل میں روز بناتا ہوں پھر سے
روز وہ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے
اب تو کیوں ہے فاصلے سے خائف اتنا
اب تو تیری خواہش پر یہ چلتا ہے
اتنی شان سے بولا کرتا ہے وہ جھوٹ
اُس کو سچ ہی مانیں ہم دل کرتا ہے
اجمل ساقی/معلا

میں نے اُس کو کھو کے پایا
پا کے پھر سے کھو بیٹھی ہوں
پہلے کم تھے دل میں غم کیا
ہجر کا درد سمو بیٹھی ہوں
اپنی جیت کا جشن منایا
اپنی ہار پہ رو بیٹھی ہوں
خوشی مقدر سے ملتی ہے
میں تو مقدر کھو بیٹھی ہوں

عشق مقدر میں ہی کب تھا
سجدوں میں بھی رو بیٹھی ہوں
میری قضا کیوں دیری اتنی
دکھ کا بار بھی ڈھو بیٹھی ہوں
طیبہ امبر/نارنگ منڈی

بقیہ انٹرویو...... منصور آفاق

ارژنگ: میانوالی کے شاعر کو لندن میں تنہائی محسوس نہیں ہوتی؟

منصور آفاق: ”شاعر کی باطنی دنیا اتنی وسیع ہوتی ہے کہ اسے کہیں بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا“

ارژنگ: آپ کا تعلق کس ادبی گروہ سے ہے؟

منصور آفاق: ”اُس گروہ سے جو ابھی وجود میں آنا ہے“

ارژنگ: کیا ادیب کا سیاست میں بھی کوئی کردار ہونا چاہیے؟

منصور آفاق: ”جس ادیب کا اپنے عہد کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں وہ ادیب نہیں۔ اس کا ادب چڑیا خانے کی حکایات پر مبنی دوسرا دنیا کا بھٹکا ہوا شوق تو ہوسکتا ہے ادب نہیں“

ارژنگ: لفظوں کو غیر متروک قرار دینے کا اختیار کس کے پاس ہے؟

منصور آفاق: ”صرف بولنے اور لکھنے والوں کے پاس“

ارژنگ: کالم میں بالکل الگ منصور آفاق نظر آتا ہے۔ شاعر منصور آفاق کو خود سے الگ کیسے کرتے ہیں؟

منصور آفاق: ”ذرا سا جھیل کی گہرائی میں اتر کر دیکھنے کی ضرورت ہے تہہ میں ایک ہی طرح کی مٹی پڑی ہوئی ہے“

ارژنگ: آپ کی زندگی کا نصب العین کیا ہے؟

منصور آفاق: ”زمین پر انسان، انسان بن کر رہنا شروع کردے“

ارژنگ: زندگی میں کون سا دور آپ کے لیے مشکل ترین دور تھا۔

منصور آفاق: ”ہر وہ دور جس سے میں گزر رہا تھا“

ارژنگ: آپ کانفرنسوں کا انعقاد بھی کرتے ہیں اور سلطان باہو کے حوالے سے آپ کا کافی کام کتابی صورت میں سامنے آیا۔ اس کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

منصور آفاق: ”سلطان باہو فارسی زبان کے ایک شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ایک فلسفی ہیں۔ مگر وقت نے انہیں صرف پنجابی کے شاعر کی حیثیت دے رکھی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے ان کی مکمل شخصیت زمانے کے سامنے آئے“

ارژنگ: مستقبل کے حوالے سے آپ کا لائحہ عمل یا نصب العین کیا ہے؟

منصور آفاق: ”مستقبل میں کیا ہونا ہے۔ یہ آسمانوں پر کہیں لکھا ہوا ہے۔ اور میں ابھی اسے پڑھنے کے قابل نہیں ہوا“

ارژنگ: خواتین کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

منصور آفاق: ”وہی جو مردوں کی شاعری کے متعلق ہے“

ارژنگ: آپ کا شمار عہد جدید کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔ ادبی حلقوں میں تو آپ کو کافی پذیرائی ملی۔ حکومتی سطح پر اس کا اعتراف نہیں کیا گیا کوئی خاص وجہ؟

منصور آفاق: ”حکومتی سطح پر زیادہ تر انہیں کو پذیرائی ملتی ہے جو اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اپنا مزاج ایسا نہیں ہے“

ارژنگ: آپ نے فیض اور فراز کے حوالے سے موازنہ کیا اور بطور وکیل طویل مضمون لکھا۔ کیا واقعی احمد فراز بڑے شاعر ہیں فیض سے یا دوستی نبھائی ہے آپ نے۔

منصور آفاق ”میں ابھی بھی یہی سمجھتا ہوں۔ پوری ایمان داری کے ساتھ“

ارژنگ: ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام۔

منصور آفاق: ”تھوڑا سا وقت اپنے ساتھ بھی گزارا کرو“

ارژنگ: سچ سچ بتائیں اب تک آپ نے کتنی محبتیں کی ہیں اور کتنی لڑکیوں نے آپ سے محبت کا اظہار کیا ہے؟

منصور آفاق: ”اللہ کا بہت کرم رہا ہے۔ دونوں طرف کوئی کمی نہیں رہی“

پہلی تعیناتی فیصل آباد جو کہ ان دنوں لائل پور ہوا کرتا تھا، کر دی گئی۔

ارژنگ: ضمنی سوال ہے کہ آپ نے اپنے اندر کے شاعر کو کب دریافت کیا؟ نیز باقاعدہ شاعری کیسے شروع کی تھی؟

خالد شریف: لکھنے پڑھنے کا کیڑا تو مجھ میں شروع سے موجود تھا۔ کالج کے فرسٹ ایئر کے دنوں کی بات ہے کہ نوٹس بورڈ پر طرحی غزل کا اشتہار دیکھا، کالج کے طلبا کے مابین اس مقابلے کے لیے طرح مصرع دیا گیا تھا۔ میں نے بھی اس مصرعے پر ٹوٹی پھوٹی غزل کہی اور اپنے کالج کے شعبہ فارسی کے ایک استاد کو دکھائی، انھوں نے ایک آدھ مصرع تبدیل کر کے ہمیں دے دی۔ حسن اتفاق سے ہماری اس غزل کو اوّل انعام مل گیا۔ اسی اوّل انعام نے ہی ہمیں پکڑ لیا۔ یہی شعری سفر کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس انعام کے بعد ہمیں سٹوڈنٹ یونین کے دفتر میں بلا کر کہا گیا کہ اگلے ہفتے ہمیں شعری مقابلے کے لیے جہلم جانا ہے۔ جہلم گئے تو وہاں سے بھی اول انعام اور ٹرافی لے آئے۔ پھر کیا تھا کہ پورے پاکستان میں جاتے اور ٹرافیاں لے کر آتے۔ خوبصورتی یہ تھی کہ ایک تو شاعری کی مشق ہوتی گئی اور دوسرا یہ ہوا کہ دوستوں کی ایک کہکشاں بنتی گئی، جن سے مشاعروں اور مقابلوں میں مختلف کالجز میں ملاقات ہوتی تھی۔ اجمل نیازی، محمود شام اور امجد اسلام امجد سے میں پہلی مرتبہ انھی دنوں شعری حوالے سے ملا تھا۔ لاہور آئے تو یہاں سرمد صہبائی کے چرچے تھے۔ جب ان کے مقابلے میں ہماری غزل کو پہلا انعام ملا تو لوگوں کی ہم میں دلچسپی بڑھی کہ یہ کون ہے، اس مقابلے کے جج جناب احمد ندیم قاسمی تھے۔ دماغ میں شاعری کا فطور تو پہلے سے ہی موجود تھا، یہ دریافت کالج کے دنوں ہوا۔

ارژنگ: کالج کے ابتدائی سالوں میں جب آپ نے شعری سفر کا آغاز کیا تھا، کوئی ایسا واقعہ جو بہت یاد آتا ہو؟

خالد شریف: جہلم میں مشاعرہ تھا۔ پورے پاکستان سے طلبا اس مقابلے میں شریک تھے۔ اسٹیج پر احمد فراز، شہزاد احمد اور احسان اکبر جیسے شعرا بیٹھے ہوئے تھے۔ جب نتیجے کے اعلان کا وقت آیا تو سید ضمیر جعفری نے مائیک پر کہا کہ خالد شریف تمھیں پہلا انعام نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ پچھلے تین مشاعروں میں تمھیں اوّل انعام دے چکا ہوں۔ تمہارا انعام یہ ہے کہ تم اسٹیج پر آ کر ہمارے ساتھ بیٹھو۔ جہاں پر احمد فراز، شہزاد احمد براجمان تھے۔ جبکہ اول انعام انھوں نے دیگر طالب علم کو دے دیا۔ یہ واقعہ ضمیر جعفری نے اپنی ڈائری میں درج کیا ہے جو کہ اب کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

ارژنگ: اشاعت کے شعبے سے وابستگی کیسے ہوئی؟ اس شعبے میں تو آپ نے انقلاب برپا کر دیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟

خالد شریف: میرے ماموں جان کے راولپنڈی میں چار پرنٹنگ پریس تھے۔ میرا بچپن انھی پرنٹنگ مشینوں کے درمیان کھیلتے ہوئے گزرا ہے۔ میں کمپوزنگ بھی کر لیتا تھا۔ پرنٹنگ مشین بھی چلا لیتا تھا۔ کتاب سے عشق مجھے ابتدا سے ہی تھا۔ ہمارے گھر کے قریب کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی۔ میں اکثر وہاں بیٹھ کر کتابیں پڑھتا۔ کتاب خانے کے مالک سے دوستی کے سبب مجھے وہ کبھی کبھی دکان پر بٹھا کر کسی ضروری کام سے جانا ہو تو چلے جاتے تھے۔ میں اکثر ان کی غیر موجودگی میں کتابیں اور میگزین وغیرہ بیچ بھی دیا کرتا تھا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ کون سی کتاب بکتی ہے اور کون سی پڑی رہتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے ابتدائی عمر میں ہی معلوم ہو گیا کہ کتاب چھپتی کیسے ہے؟ جیسے ہی میرے پاس کچھ پیسے جمع ہوئے، میں احمد فراز کے پاس چلا گیا اور ان سے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب چھاپنی ہے۔ مجھے زندگی کا پہلا چائنیز کھانا فراز صاحب نے کھلایا۔ پہلی کتاب میں نے انھی کی چھاپی تھی۔ ان دنوں دو سو کتابیں تو ڈھاکہ چلی جاتی تھیں، پانچ سو کراچی اور لاہور میں بھی کافی کھپت تھی۔ یعنی اگر ہم گیارہ سو کتابیں چھاپتے تو ہمارے پاس کوئی کتاب نہ بچتی تھی۔ فراز کی تو پانچ ہزار کتب کا ایڈیشن چھاپتے تھے۔ انھی دنوں رضیہ بٹ کا ناول چھاپا۔ وہ اپنے پبلشر سے ناخوش تھیں، شاید اسی لیے انھوں نے بغیر کسی تفصیل اور ہچکچاہٹ کے کہہ دیا کہ لے جاؤ اور چھاپ دو۔ پھر وہ ہوا جو اکثر سرکاری ملازمین کے ساتھ ہوتا ہے، ہمارا راولپنڈی سے لاہور تبدیلی کا پروانہ ہو گیا۔ ہم روتے پیٹتے لاہور آ گئے۔

لاہور میں ان دنوں فلمسٹار حبیب بہاولپور روڈ پر کچھ

فلیٹ بنا رہے تھے۔ ایک ڈیڑھ مرلہ جگہ کا فلیٹ ایک لاکھ چالیس ہزار میں فروخت کر رہے تھے۔ ہمارے پاس صرف چالیس ہزار تھے۔ انھوں نے فلیٹ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی مگر شرط رکھی کہ ان کی فلم کے گانے میں لکھوں۔ میری شرط تھی کہ میں سٹوڈیو نہیں جاؤں گا یہیں بیٹھ کر لکھوں گا۔ انھوں نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے رجسٹری ہمیں پکڑا دی اور باقی کی رقم میں قسطوں میں ادا کرتا رہا۔ اسی جگہ میں نے ماورا کے نام سے پبلشنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مال روڈ کی اس عمارت میں بعدازاں منتقل ہوا۔ یہاں آ کر اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ راولپنڈی میں جس کتاب کو چھاپنے میں چار چھ مہینے لگتے ہیں لاہور میں وہ چار چھ دنوں میں شائع ہو جاتی ہے۔

ارژنگ: آپ کے اشاعتی ادارے کا نام ''ماورا'' آپ کو کیسے سوجھا؟

خالد شریف: یہ اردو کے عہد ساز شاعر ن م راشد کی پہلی کتاب کا نام تھا۔ ادارے کا نام ''ماورا'' انھی سے مستعار لیا ہے۔ ن م راشد کے کلیات میں میں نے اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام بھی آج کل ہم ہی شائع کر رہے ہیں۔

ارژنگ: ابتدائی زندگی کیسی اور کہاں گزری؟ اس بارے میں کچھ بتائیے گا؟

خالد شریف: ہم لوگ انبالہ سے مہاجر ہیں۔ میری پیدائش 1947ء میں ہوئی۔ میں چھ ماہ کا شیر خوار تھا جب ہم پاکستان ہجرت کر کے پہنچے۔ راولپنڈی میں میرے والد نے راجہ بازار میں گھڑیوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول سے حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج راولپنڈی میں داخلہ لیا اور وہیں سے ایم اے کی ڈگری لی۔ بعدازاں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے سول سروس میں آ گیا۔

ارژنگ: محسن نقوی اور آپ کی تحریروں کے علاوہ ادبی حلقوں میں یہ بات گفتگو کا موضوع رہتی ہے کہ آپ دونوں کا تعلق پبلشر اور شاعر سے زیادہ دوستی کا تھا۔ اس بارے میں ہمارے قارئین کو کچھ بتائیں گے؟

خالد شریف: ملکہ کوہسار مری میں 1973 کو ایک مشاعرہ ہوا۔ میں مشاعرہ پڑھنے کے بعد اسٹیج سے نیچے اُترا تو ہجوم میں سے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ یہ محسن نقوی تھے اور ان سے پہلی ملاقات تھی۔ میری کتاب نارسائی کے دیباچے میں محسن نے اس کی تمام تفصیل لکھی ہے۔ پتا چلا کہ وہ بڑے شاعر اور ذاکر ہیں۔ ہمارا مسلک مختلف تھا۔ وہ سید بادشاہ تھے اور میں راجپوت، مگر میرے دل میں ہمیشہ سے اہل بیت رسولؐ کے لیے ایک نرم گوشہ اور محبت موجود تھی۔ ٹرانسفر ہو کر جب لاہور آیا تو علامہ اقبال ٹاؤن نشتر بلاک میں ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا۔ ہمارے درمیان ایسی دوستی ہو گئی کہ وہ ہمارے گھر کا فرد بن گیا۔ میری بیگم ان کی بہن بن گئی۔ محسن نقوی کو بطور شاعر ہمارے ادارے نے متعارف کروایا۔ گو کہ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک کتاب شائع ہو چکی تھی مگر وہ ان کو پسند نہیں تھی۔ بہت بری چھپی تھی اور شاعری بھی طالب علمی کے دور کی تھی۔ میں نے کتاب شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے مجھے 1978 میں برگِ صحرا کا مسودہ دے دیا۔ ساتھ ہی اپنا مخصوص جملہ کہ یہ آپ کے لیے چیلنج ہے۔ اسے کیسے خوبصورت چھاپتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں آپ کو گولڈ دے رہا ہوں اس کے بعد ان کی کتابیں آتی رہیں، میں شائع کرتا رہا۔ شام کو وہ روزانہ چار بجے کے قریب ''ماورا'' آ جاتے۔ یہاں سے ہم آٹھ بجے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل چلے جاتے، ہماری شامیں اکثر اکٹھے گزرتیں۔ پی سی سے ہم گھر چلے جاتے۔ واپسی پر وہ لبرٹی مارکیٹ سے قوام والا پان لیتے تھے۔ ان کی شہادت تک ہماری یہی روٹین رہیں۔ ہم دونوں میں ایک بات مشترک تھی کہ ہم کسی بھی ادبی گروہ کا حصہ نہیں تھے۔

ارژنگ: یہ عجب بات ہے کہ آپ نے سینکڑوں کتابیں شائع کیں مگر آپ کی اپنی پہلی کتاب بہت تاخیر سے شائع ہوئی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

خالد شریف: پہلی کتاب تو میری ان دنوں ہی مکمل ہو گئی تھی جب میں راولپنڈی میں تعینات تھا، کتابت بھی کروالی گئی تھی۔ یہ ہوتا رہا کہ پہلے کوئی اور کتاب آ گئی۔ کبھی فراز، کبھی محسن نقوی اور منیر نیازی، کبھی قتیل شفائی اور مظفر وارثی کی کتاب۔ جن دنوں ٹی وی ڈرامہ ''وارث'' آیا تو امجد اسلام امجد کی کتابوں کی فروخت میں یک دم اضافہ ہو گیا۔ بہت سارے سال گزر گئے۔ محسن نقوی نے دیباچہ بھی لکھ دیا۔ خیر اب تو اس کتاب کے پچیس ایڈیشن ماشاءاللہ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تین شعری مجموعے اور دو انتخاب شائع ہوئے ہیں۔

کچھ شعر، چند دوست، کتابیں، کسی کا پیار
خالد یہی کمائی میری عمر بھر کی ہے

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

کیپٹن عطا محمد خان کے ساتھ شام

گزشتہ دنوں شاعر اور چیف ایگزیکٹو لاہور آرٹس کونسل کیپٹن عطا محمد خان کے ساتھ ایک شام کا انعقاد کیا گیا۔ جس کا اہتمام ادبی تنظیم پہچان لاہور نے کیا۔ تقریب کی صدارت عطاء الحق قاسمی نے کی۔ مہمانِ خصوصی اصغر ندیم سیّد تھے۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا جس کی سعادت افضل قادری نے حاصل کی۔ بارگاہِ نبویؐ میں عقیدت کے پھول نازیہ نیاز اور عبدالمجید چٹھہ نے بکھیرے۔ ابتدا میں پہچان کے چیئرمین اور شاعر حسن عباسی نے تمام مہمانوں کی آمد کا شکریہ ادا کیا اور کیپٹن عطا محمد خان کے حوالے سے لکھی ہوئی اپنی نظم پیش کی۔ جس کو بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد صدف قیوم نے صاحب شام کی فن و شخصیت کے حوالے سے اپنا مضمون پڑھا اور حاضرین کو یہ بھی بتایا کہ اُس نے حال ہی میں اُن کی شاعری پر ایم فل کیا ہے۔ معروف گلوکار سجاد بری نے کیپٹن عطا محمد خاں کی غزل ترنم میں سنا کے سماں باندھ دیا۔ اس موقع پر ملک سلیم اختر نے اُن کے حوالے سے اپنی نظم بھی پیش کی۔ جس کو بہت پسند کیا گیا۔ گل نوخیز اختر نے روایتی انداز میں پر لطف مضمون سنا کر محفل کو کشت زعفران بنا دیا۔ ڈاکٹر مختیار عزمی نے صاحب شام کے ساتھ اپنی دیرینہ رفاقت کے حوالے سے بڑے خوبصورت انداز میں اظہار خیال کیا۔ خالد شریف نے اپنے خطاب میں کیپٹن عطا محمد کی شاعری اور شخصیت کو بھرپور انداز میں سراہا اور ان کے منتخب اشعار سنا کر حاضرین سے خوب داد وصول کی۔ معروف ڈرامہ رائٹر اور شاعر اصغر ندیم سیّد نے اپنے اظہار خیال میں ان کی نہایت عمدہ اور منفرد شاعر قرار دیا۔ صاحب شام کو اظہار خیال سے قبل لاہور کی مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے گلدستے اور تحائف پیش کیے گئے۔ اس موقع پر ان سے شاعری بھی سنی گئی جس سے محفل کا لطف دوبالا ہو گیا۔ آخر میں صاحب صدر اور چیئرمین پی ٹی وی لاہور نامور ادیب عطاء الحق قاسمی نے اپنی گفتگو میں کہا میں نے اپنی زندگی میں کیپٹن عطا محمد خاں سے بڑھ کر عاجز اور منکسر المزاج افسر نہیں دیکھا۔ انھوں نے کہا میں نے پہلے ان کی شاعری پڑھ رکھی ہے مگر آج جو شاعری یہاں پیش کی گئی اُس کا انتخاب اتنا لاجواب تھا کہ میری نظر میں اُن کا مقام بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ تقریب کے آخر میں میزبان حسن عباسی نے ایک بار پھر تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ نواز کھرل نے اپنی خوب صورت اور جاندار نظامت سے تقریب کے حسن میں مسلسل اضافہ کیے رکھا۔ تقریب میں زندگی کے مختلف طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھرپور شرکت کی۔

وجدان کانفرنس

☆ وجدان کے زیرِ اہتمام الحمرا کلچرل کمپلیکس لاہور میں یک روزہ کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس کا مقصد صوفیا کرام کے امن پیار، برداشت اور بھائی چارے کے پیغام کا فروغ تھا۔ پہلا سیشن ''سماجی مسائل اور تصوف'' کے حوالے سے تھا جس میں پیر سلطان فیاض الحسن قادری اور ڈاکٹر صغریٰ صدف نے اظہار خیال کیا۔ دوسرے سیشن کی صدارت منو بھائی نے کی۔ اصغر ندیم سیّد مہمان خصوصی تھے اس کا موضوع تھا ''مثبت معاشرتی رویوں کے فروغ میں میڈیا کا کردار'' جس میں عبدالرؤف، قیم مسعود، صوفیہ بیدار اور فقیق الور راجا، نبیل انجم نے اظہار خیال کیا۔ آخری سیشن میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی صدارت برطانیہ میں مقیم نامور شاعر اور کالم نویس منصور آفاق نے کی۔ مہمانِ خصوصی رنجیت چوہان (بھارت) تھے۔ مشاعروں میں لاہور اور مختلف شہروں سے تشریف لائے ہوئے شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس موقع پر منصور آفاق کو ان کے شعری مجموعے ''دیوانِ منصور'' کو 2015 کا ایوارڈ دیا گیا جس کے ساتھ ایک لاکھ روپے کی رقم بھی پیش کی گئی اور رنجیب چوہان کو فروغ امن کے حوالے سے ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے ساتھ پچاس ہزار روپے پیش کیے گئے۔

قومی کانفرنس برائے ادبِ اطفال

اکادمی ادبیات اطفال، پاکستان چلڈرن میگزین سوسائٹی اور پھول کے اشتراک سے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل لاہور کے شالیمار ہال میں اچھوتی یادگار اور پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی کانفرنس برائے ادبِ اطفال کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع تھا ''امن اور ترقی بذریعہ ادبِ اطفال'' ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ بچوں کے ادیبوں کے لیے عالمی معیار کی

کانفرنس منعقد ہوئی جس کے میزبان پاکستان چلڈرن میگزین سوسائٹی کے صدر مدیر پھول محمد شعیب مرزا اور اکادمی ادبیات اطفال کے وائس چیئرمین حافظ مظفر محسن تھے۔ کانفرنس کے انعقاد کا مقصد ملک بھر سے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، مل بیٹھ کر باہم مشورے سے لائحہ عمل تیار کرنا اور بچوں کے ادب کو مزید فروغ دینا تھا۔ کانفرنس میں آزاد کشمیر سمیت کراچی، لاہور، مردان، ملتان، کوئٹہ، اسلام آباد، کسوال، ہارون آباد، پشاور، جھنگ، خانیوال اور میانوالی کے علاوہ ملک بھر سے بچوں کے ادیبوں نے بڑے شوق و ذوق سے شرکت کی۔ 150 منتخب بچوں کے ادیبوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ کانفرنس 4 مختلف نشستوں پر مشتمل تھی اور ہر نشست میں بچوں کے ادیبوں نے منتخب موضوعات پر گفتگو کی۔

سعادت حسن منٹو کی 104ویں سالگرہ پر بک رائٹرز کلب کی تقریب

(لاہور پ، ر) بک رائٹرز کلب کے زیراہتمام اُردو ادب کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی 104 ویں سالگرہ کے موقع پر ایک تقریب منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت بک رائٹرز کلب کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کی۔ اس تقریب میں ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں نے شرکت کی اور منٹو کی سالگرہ پر کیک کاٹا گیا۔

اس تقریب سے پروفیسر راشد حسن رانا، زاہد مسعود، سید نوید عباس ایڈووکیٹ، کامریڈ زوار حسین، ایم سرور، نوید خان پشکن، محمد انور، عاطف رحمان، خالد یزدانی، میم سین بٹ، شہزاد فراموش اور رانا عبدالرحمٰن نے خطاب کیا۔ مقررین نے اپنے خطاب میں کہا کہ سعادت حسن منٹو کی اردو ادب میں بے پناہ خدمات ہیں جس وجہ سے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ کیونکہ منٹو نے اپنی کہانیوں میں سماجی مسائل کو اُجاگر کیا۔ قیامِ پاکستان کے موقع پر عوام کو جو تکالیف اور قربانیاں دینی پڑیں ان کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جب منٹو نے معاشرتی مسائل کا حقیقی عکس اپنے افسانوں میں اُجاگر کیا تو سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے فحش نگاری کا الزام لگایا۔ ان پر مقدمات قائم کیے گئے مگر منٹو نے اپنا انداز بیان تبدیل نہیں کیا۔ وہ آخری دم تک عوامی تخلیق کار کی طرح اپنے قلم سے حکمرانوں پر نشتر چلاتے رہے۔ یہ منٹو کے قلم کی سچائی ہے کہ ان کی تحریریں زندہ جاوید ہیں اور اسی طرح منٹو کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آخر میں بک رائٹرز کلب کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے اپنی صدارتی تقریب میں کہا سچا ادیب کبھی نہیں مرتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے کیونکہ عوام ان کو کبھی نہیں بھولتے جو عوام کی بات کرتے ہیں۔ اس لیے سعادت حسن منٹو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُردو ادب کے قارئین میں سعادت حسن منٹو آج بھی مقبول ترین ادیب ہے۔

''ادارۂ خیال و فن'' کے زیراہتمام نیلما ناہید درانی کے شعری مجموعہ ''واپسی کا سفر'' کی تقریب رونمائی

لاہور کی فعال ادبی تنظیم ''ادارۂ خیال و فن'' کے زیراہتمام 2 جون 2016 کو نامور شاعرہ نیلما ناہید درانی کے تازہ شعری مجموعہ ''واپسی کا سفر'' کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ یہ باوقار تقریب اکادمی ادبیات پاکستان کی پنجاب شاخ کے اشتراک سے اکادمی کے علامہ اقبال ٹاؤن لاہور آفس میں ہوئی۔ صدارت نامور شاعر نجیب احمد نے کی۔ خصوصی مہمان رخسانہ نور اور پروفیسر مسرت کلانچوی تھیں۔ نظامت کے فرائض ادارۂ خیال و فن کے صدر ممتاز راشد لاہوری نے ادا کیے اور انھوں نے نیلما ناہید کا مختصر تعارف اور اس شعری مجموعہ کا تعارف بھی پیش کیا۔ اس سے قبل نیلما ناہید کی درجن بھر کتب آ چکی ہیں جن میں جاپان اور بھارت کے سفرنامے بھی شامل ہیں۔ ''واپسی کا سفر'' میں ان کی بیسیوں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ اس تقریب میں نیلما ناہید کے فن و شخصیت پر پندرہ سے زائد اہل قلم نے اظہار خیال کیا۔

ڈاکٹر ایم ابرار کے ساتھ ایک شام

گزشتہ دنوں باغ جناح لاہور کے کاسموپولیٹن کلب میں نقش ہاشمی فاؤنڈیشن کے زیراہتمام شاعر، ادیب، کمپیئر ڈاکٹر ایم ابرار کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ جس کی صدارت بین الاقوامی شہرت یافتہ مصور اسلم کمال (تمغہ حسن کارکردگی) نے کی۔ مہمان خصوصی نامور اداکار علی اعجاز (تمغہ حسن کارکردگی) تھے۔ مہمانانِ خاص میں ناصر چودھری، اعتبار ساجد، اختر ہاشمی، ڈاکٹر افتخار بخاری، سحرش خان (ٹی وی آرٹسٹ) تھیں۔ جبکہ مہمانانِ اعزاز میں تسنیم کوثر (شاعرہ) پروین سجل، ایم زیڈ کنول، عاصم خواجہ شامل تھے۔ تلاوت شبنم مرزا نے کی۔ ترجمہ علامہ خورشید کمال نے پیش کیا۔ عدل منہاس لہوری، سید احمد حسن، مظہر اللہ قریشی، شگفتہ غزل ہاشمی، مظہر جعفری، انوار قمر، علامہ خورشید کمال، جاوید آفتاب، صائمہ الماس مسرور، فاطمہ غزل، مشتاق قمر، ممتاز راشد، تہمینہ رانا، پروفیسر نذر بھنڈر، حاجی محمد لطیف کھوکھر، بی اے شاکر، ندا سرگودھوی، محمد جمیل، اعجاز اللہ ناز، ایم آر مرزا، گلشن

عزیز، عقیل شافی، یٰسین خاں، میجر (ر) خالد نصر، انجم فراز سومرو نے اظہار خیال کیا اور آخر میں ان کی سالگرہ کا کیک بھی کاٹا گیا۔

علی یاسر کے دوسرے شعری مجموعے ''غزل بتائے گی'' اور اظہر حسین کے افسانوی مجموعے ''اکیسویں صدی کی لڑکی'' کی تقریب پذیرائی

ادبی تنظیم بیاض کے زیر اہتمام اسلام آباد سے تشریف لائے شاعر علی یاسر کے دوسرے شعری مجموعے ''غزل بتائے گی'' اور اظہر حسین کے افسانوی مجموعے ''اکیسوی صدی کی لڑکی'' کی تقریب پذیرائی الحمرا ہال (لاہور) میں ہوئی۔ صدارت قائم نقوی نے کی۔ مہمانِ خصوصی جمشید چشتی اور مہمانِ اعزاز کنور امتیاز احمد تھے۔ ابتدا میں اظہر حسین کی کتاب ''اکیسویں صدی کی لڑکی'' کے حوالے سے مضامین پڑھے گئے۔ تقریب کے دوسرے حصے میں علی یاسر کے مجموعے ''غزل بتائے گی'' کے حوالے سے عباس تابش، علی اصغر عباس، ڈاکٹر غافر شہزاد، نسیم صادق، حسن عباسی اور نعمان منظور نے اپنے مضامین پیش کیے۔

''راستی'' اور ''ادارۂ خیال وفن'' لاہور کی شام صوفیہ بیدار

نامور ادیبہ اور شاعرہ صوفیہ بیدار کی پنجابی کالموں ''ست گر'' کی تقریب رونمائی ادارۂ خیال وفن لاہور اور عالمی فلاحی ادبی ثقافتی تنظیم ''راستی انٹرنیشنل'' کے زیر اہتمام اکادمی ادبیات لاہور میں منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر اجمل نیازی، مہمانِ خاص ڈاکٹر اختر شمار، رخسانہ نور، پروفیسر مسرت کلانچوی، نظامت کے فرائض پہلے دور میں صدر ادارۂ خیال وفن ممتاز راشد لاہوری اور دوسرے دور میں ''راستی'' کی چیئرمین نیلما ناہید درانی نے ادا کیے۔ صوفیہ بیدار اور ''ست گر'' کے بارے میں اظہار خیال کرنے والوں میں میرانِ محفل کے علاوہ حمیدہ شاہین، اعتبار ساجد، جمیل پال، منشا قاضی، زاہد حسن، محمد مکرم خاں (کالم نگار)، اعجاز اللہ ناز، سید احمد حسن زیدی، انیس احمد، شبیر حسن، شہزادہ کبیر احمد، فراست بخاری، محمد جمیل اور صوفیہ بیدار کے چھوٹے بھائی یاسر (کالم نگار، براڈ کاسٹر) شامل تھے۔ صدر محفل نے صوفیہ کی اردو اور پنجابی کاوشوں کی بے حد تحسین کی۔ صوفیہ نے اپنے ادبی سفر کا پس منظر بیان کیا اور اس تقریب کے لیے نیلما ناہید درانی، ممتاز راشد اور اکادمی کے محمد جمیل کا شکریہ ادا کیا۔

تقریب پذیرائی اور محفل مشاعرہ

پچھلے دنوں ادب سرائے ساہیوال کے زیر اہتمام معروف شاعر احمد جلیل کے تازہ شعری مجموعے ''چاندنی کی بارش میں'' کی تقریب پذیرائی کا انعقاد کیا گیا۔ اس ادبی نشست کے مہمانِ خصوصی اور صاحب شام احمد جلیل تھے اور صدر محفل سید ریاض حسین زیدی، مہمانِ اعزاز پروفیسر اکرم ناصر رہے۔ یہ تقریب دو حصوں پر مشتمل تھی۔

کل ہند اجتماعی مذاہب، آگرہ کلب، آگرہ (رجسٹرڈ) کی جانب سے مشاعرہ

31 مئی 2016 سے 4 جون تک چلنے والے حضرت سید شیخ فتیح الدین بلخی کے 417 ویں عرس مبارک کے موقع پر اپنی سابقہ روایات کے تحت 2 جون کو مشہور و معروف افسانہ نگار جناب حنیف سیّد کے دست مبارک سے شمع روشن کے بعد انھیں کی صدارت میں بزم کے سیکرٹری جناب وجے کمار جین المعروف زین العابدین نے تلاوتِ قرآن سے ابتدا کی۔ کماری دیپا پانڈے، جیوتی ورما، شیام پانڈے، ارپت پانڈے اور اُمیش چندیل نے نعت پاک سنا کر سامعین کو بے خود کیا۔ اس کے بعد جناب ماہر اکبر آبادی، انجم اکبر آبادی، ظہیر اکبر آبادی، گلزار اکبر آبادی، سلیم اکبر آبادی، سیّد تنویر احمد نظامی اکبر آبادی، سیّد رضوان احمد نیازی قرار اکبر آبادی، مشکور کانپوری، راحت القادری اور ڈاکٹر سرفراز احمد فرازؔ اکبر آبادی نے منقبتی کلام پیش کیے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر راجیش مشرا، مہمان ذی وقار شاہ جہاں پور سے آئے جناب سرلیش پاٹھک رہے۔ نظامت سیّد تنویر احمد نظامی اکبر آبادی نے کی۔ آخر میں صدر جناب حنیف سیّد نے اردو کے اسباب تنزل پر مدلل تبصرہ کیا۔ اور بزم کے سیکرٹری نے ویسٹ بنگال کے گورنر عزت مآب کیشری ناتھ ترپاٹھی، گجرات کے گورنر عزت مآب او پی کوہلی، اڈیشا کے گورنر عزت مآب ایس سی جمیل اور گوا کی گورنر عزت مآب شری متی مردولا سنہا کے ساتھ جمہوریہ ہند کے صدر عزت مآب جناب مکھرجی کے پیغام بھی پڑھ کر سنائے۔

امجد صابری کے قتل پر اظہار افسوس

نامور قوال امجد فرید صابری کے قتل پر بزم پرنم کے چیئرمین محمد اقبال پیام شجاع آبادی و دیگر عہدیداران نے اظہار افسوس کیا ہے اور اس ظالمانہ اور بہیمانہ قتل کی پرزور مذمت کی ہے۔ بزم پرنم نے شہید کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام بھی کیا۔ چیئرمین بزم پرنم نے حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائے اور ورثا کی بھرپور مالی معاونت کرے۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: اناپا/شاعر: ڈاکٹر وقار خان/صفحات: 160 / قیمت: 350 روپے/ڈاکٹر ستیا پال آنند
ناشر: سخن سرائے پبلی کیشنز، ملتان

ڈاکٹر وقار خان کی شاعری میں فیض اسکول اور ن م راشد اسکول، دونوں سے قربت بھی ہے، دوری بھی ہے اور انحراف بھی۔ ایک منفرد لہجہ تلاش کرتے ہوئے وہ خاردار راستوں کو ہموار کرنے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اس عمل کے دوران وہ روایت کے اندر رہتے ہوئے بھی اجمالی کیفیات میں ایک ایسا خاص اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہیں جو بصیرت اور بصارت دونوں کو اپنی کشش اور رگِ جاں تک رسائی دیتا ہے۔ شاعر نے اس جدت کا بطورِ خاص التزام برتنے کی کامیاب سعی کی ہے کہ بیرونی ہیکیت سے ہٹ کر اسمائی، مکنون و مکتوم اظہاریہ کی منظر کشی ایسے ہو جیسے ایک کیمارڈ کی تصاویر کا سلسلہ ہوتا ہے۔ کسی بھی تخلیق میں تکلیف دہ تلذذ کی کیفیت افسانہ نگاروں کو تو یورپی ادب سے ورثے میں ملی ہے لیکن شعرا کو کم کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ وقار خان اس تکنیک میں مشاق ہیں۔ موضوعات کے انتخاب میں ان کی نظر صرف فقر و استغنا سے مملو خودداری اور وسیع المشربی کی سماجی جہت پر پڑتی ہے لیکن اس پر شاکر نہیں رہتے۔ اس ضمن میں بھی وہ "عمومی" ہونے کی سطح مرتفع کے ہاں اکتشافاتی یا "دریافت کردہ" سچائیوں کو اپنی شعری نبض کی دھڑکن میں سمو لینے کی وہ جدت رکھتے ہیں جو عام شعراء کے ہاں خال خال ملتی ہے۔

نام کتاب: راستے میں شام/شاعر: توقیر علی زئی/صفحات: 220 / قیمت: 400 روپے/خاور چودھری
ناشر: تیمرا ارخ پبلشرز، اسلام آباد

توقیر علی زئی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ان کا غزلیہ کلام باقی کلام کی نسبت زیادہ ہے لیکن انھوں نے نظم گوئی میں بھی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی پابند اور آزاد نظمیں خوب رواں دواں ہیں اور موضوع کو ایک ندی کے بہاؤ کی طرح ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ غزل کے بعد انھوں نے قطعہ نگاری اہتمام کے ساتھ کی۔ اس کی ایک وجہ تو شاید ان کے دوست اسحاق آشفتہ کی قطعہ نگاری ہو سکتی ہے اور دوسرا انھیں مقامی اخبار میں بھی اس کا موقع ملا۔ انھوں نے میری ادارت میں شروع ہونے والے ہفت روزہ 'معترف' میں بیشتر قطعات لکھے۔ بعض نظمیں، جیسے 'بیٹے تبریز' اور 'چودہ اگست' وغیرہ بھی اسی اخبار کے لیے کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزل کے میدان میں انھوں نے جس مہارت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا دوسرے میدانوں کی نسبت زیادہ مستحکم اور قابلِ توجہ ہے۔

توقیر علی زئی کو نئی نئی زمینوں اور مختلف بحروں میں کہنے کا شوق تھا۔ زیادہ تر اُن کے یہاں غالب کی سی مشکل پسندی کا رُجحان ہے۔ انھوں نے فکری اعتبار سے خود کو کسی ایک خانے میں بند نہیں کیا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی رنگ اُن سے چھوٹ گیا ہو۔ رائج مضامین تو ان کے یہاں اپنا جلوہ دکھاتے ہی ہیں۔ عصری موضوعات بھی ان کے قلم کے محیط میں ہیں۔ انھوں نے ہوش مند اور بالغ نظر شاعر کی حیثیت سے اپنا قلم رواں رکھا۔ قدیم و جدید معاشروں کے خال و خط اجاگر کرنا اور ان کی آمیزش کرنا توقیر علی زئی کے شاعرانہ مزاج کا خاص وصف ہے۔ یہ رویہ زیادہ تر نظموں میں ظاہر ہوتا ہے۔ توقیر کی غزل جان دار بھی ہے اور طرح دار بھی۔ انھوں نے محض نمود اور شاعر ہونے کا ٹھپہ لگانے کے لیے شاعری نہیں کی بلکہ عطائے ربِ جلیل کو بروئے کار لاتے رہے۔ اُن کے اندر شاعری کا فطری جوہر موجود تھا، جسے انھوں نے کمال مشاقی اور مہارت سے چمکایا۔ ایک ایک زمین میں کئی کئی غزلیں کہیں، طرحی مصرعوں پر وہ نہایت آسانی سے کہہ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح بعض موقعوں پر فی البدیہہ گوئی کا تو میں خود بھی شاہد ہوں۔

نام کتاب: ظرف/شاعر: محمد عرفان قانی/صفحات: 128 / قیمت: 200 روپے/اصغری صدف
ناشر: سخن سرائے پبلی کیشنز، ملتان

فتح پور کی فضاؤں میں سانس لینے والا صحافی عرفان قانی اپنی فکر، احساس اور جذبے سے لفظوں کے پر لگا کر خوشبو کی طرح چار سو بکھرنے کا خواہاں ہے۔ مضافات کا کھرا پن اور کچل رنگ اس کی شاعری کی منفرد پہچان اور حسن ہے۔ شاعری اس کے لیے زندگی کے دکھ سکھ، خواب، خواہش اور آرزوؤں کے اظہار کا نام ہے۔ اس کے دلی احساسات کے بیان کے ساتھ ساتھ معاشرے کی دکھتی رگ بھی کراہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ عرفان قانی اس دور کا نمائندہ ہے جہاں ہر طرف فضا میں بارود، نفرت اور بے

گاگی کا آلودہ زہر پھیلا ہوا ہے۔اس ماحول میں سانس لینا، مسکرانا اور خوش رہنا زندگی کو جیتنا بے پناہ دشوار نظر آتا ہے مگر عرفان قانی اس ماحول سے قطعاً مایوس نظر آتا ہے۔ اس کے لفظوں کی بناوٹ میں اُمید، خواہش اور بہتر مستقبل کے خواب تعویذوں کی طرح بندھے نظر آتے ہیں۔اس کا ایمان ہے کہ یہ حالات بدل جائیں گے اور دنیا امن اور محبت کے راستے پر پھر سے اپنے سفر کا آغاز کرے گی۔اس تلخ صورت حال میں عرفان قانی کی خوابوں بھری شاعری اُمید افزا پیغام دے رہی ہے۔اس کی شاعری میں ترقی کے بے پناہ امکانات ہیں اور آنے والے وقتوں میں اس کے تجربات شعور کی بھٹی میں جل کر مزید نکھریں گے۔میں اس کی پہلی کتاب ''ظرف'' کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتی ہوں اور اُمید کرتی ہوں کہ شاعری کے رستے پر چلتے ہوئے قانی کا عرفان اس سطح کو ضرور چھولے گا جو اسے لافانیت عطا کرے گی۔

نام کتاب: ریت کے گھر/شاعر: عاصم عاصی/صفحات: 160 / قیمت: 160 روپے/ اسعد قیس
ناشر: روزن پبلی کیشنز، گجرات

نوجوان شاعر عاصم عاصی سے جب میں پہلی بار ملا تو بڑی حیرت ہوئی۔کیونکہ وہ مجھے شکل وصورت کے اعتبار سے کسی طرح بھی زرد دکھائی نہیں دیتا تھا۔اور جب میں نے اس سے دریافت کیا ''یار بتاؤ کہ تم نے اب تک کتنے گناہ کیے ہیں یا کس کس گناہ سے فیض یاب ہو چکے ہو تو اس نے بڑی انکساری سے ہنس کر مجھے ٹال دیا۔'' مگر شعروں میں وہ سب استعارے موجود ہیں جو کسی بھی شخص کے لاشعور کی ترجمانی کرتے ہیں۔شعر کو اعتبار بخشنے کے لیے شاعر کو جس اذیت سے بار بار گزرنا پڑتا ہے اس کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں کیونکہ اس کا ادراک حاصل کرنے کے لیے اُسے یعنی شاعر کو اپنے اندر کی تہذیب کرنا پڑتی ہے۔
شاعری ماں کی گود کی طرح ہے جو شاعر کے سارے دکھ سمیٹ کر اپنی جھولی میں ڈال لیتی ہے۔شعر میں کربِ ذات کا دُکھ جب تک شاعر کی اعلیٰ فنی اور تخلیقی مہارت کے سبب قاری کے دل سے گزرتا ہوا اس کی جمالیاتی حس کی رُوح کے آر پار نہیں ہو جاتا شعر نہیں کہلاتا۔عاصم عاصی شعر کی اسی جمالیاتی حس کے کرب میں جلتا ہے۔اس لیے اس کو ایک اچھا شاعر تسلیم کرنا پڑتا ہے۔پروردگار اس کے حرف کو روشن کرے۔

نام کتاب: آخری پھول/مصنف: گل زیب عباسی/صفحات: 272 / قیمت: 350 روپے/ڈاکٹر طاہر تونسوی
ناشر: فجر پبلی کیشنز، لاہور

''زہریلے پھول'' اور ''پھول چہرے'' کے افسانوں کا لکھاری ابھی تازہ دم ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ شاعری بھی کر رہا ہے اور شعر گوئی وشعر فہمی کے مثبت اثرات اس کی کہانیوں میں بھی موجود ہیں۔اس لیے کہ ان کہانیوں میں شعری اسلوب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔اور وہ اپنے شاعرانہ مزاج کے باعث کہانی کو بوجھل بھی نہیں ہونے دیتا۔اس طرح قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔افسانوں کے نام بھی ان کی تخلیقی فعالیت کی آئینہ داری کرتے ہوئے کہانی کو سمجھنے اور سمجھانے میں بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔جہاں تک افسانوں کے موضوعات کا تعلق ہے تو ان کی خوبی یہ ہے کہ ان سب میں ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار اور موضوعات دونوں بول رہے ہیں، اس طرح سماجی تضادات اور گروہی تعصبات کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کی مصلحتوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔عنوان اور موضوع میں تضاد نہیں ہوتا۔

نام کتاب: خواب ادھورے ہیں/انتخاب: سید مبارک علی شمسی/صفحات: 112 / قیمت: 200 روپے/تبصرہ نگار: کاشف محمود بٹ
ناشر: عکس پبلشرز، ملتان

سید مبارک علی شمسی سے میری دوستی اور رفاقت عرصہ دس سال سے ہے اور ان کا مزاج شاعرانہ اور ادبی ہے۔ان کی شاعری کے مختلف رنگ صفحۂ قرطاس پر قوسِ قزح کی مانند بکھرے نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری کا سب سے حسین رنگ اہل بیت اطہار علیہ السلام کی تعریف و توصیف ہے اور اسی پاک رنگ کی وجہ سے اُن کی شاعری کامیاب ہے۔ایک شاعر کے دلی جذبات واحساسات اس کے دل و دماغ کی ترجمانی کرتے ہیں۔اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جس موضوع پر شاعری کرتے ہیں اس کی گہرائی میں ڈوب کر اُسے تحریر کرتے ہیں۔نوجوان اور جذباتی شاعر ہیں۔وطن عزیز کے علاوہ جاپان، ایران، روس اور جرمنی کے اخبارات و رسائل میں ان کی تحریریں چھپتی رہتی ہیں جنھیں پڑھ کر فخر ہوتا ہے۔خصوصاً صحافت اور الیکٹرانک میڈیا اور اس کے لیے ان کی بے لوث انتھک خدمات قابل تحسین و تعریف ہیں۔علمی و ادبی محافل، سیمینارز میں شرکت اور ان کا انعقاد بھی ان کا خصوصی شوق ہے۔سرزمین بہاولپور پر جہاں بہت بڑے قابل احترام احترام نام موجود ہیں اُن میں سید مبارک علی شمسی کا

نام آسمان پر کسی درخشندہ ستارے کی طرح چمکتا نظر آتا ہے۔ جو باعثِ فخر ہے۔ سب سے بڑھ کر ان کا سید ہونا ہے اور علم سادات پاک کی میراث پاک ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کے حضور صدقِ دل سے دعا گو ہوں کہ وہ سید مبارک علی شمسی کو مستقبل میں عزت، شہرت اور کامیابیاں عطا فرمائے اور ہماری مخلصانہ دوستی کو ہمیشہ قائم رکھے۔

نام کتاب: چٹکی بھر دھوپ / شاعر: سید یونس اعجاز / صفحات: 264 / قیمت: 500 روپے / امجد اسلام امجد
ناشر: زربفت پبلی کیشنز، لاہور

یونس اعجاز کہنے کو تو اُردو کی نئی بستیوں کے مکیں ہیں مگر وطن سے اتنی طویل دوری کے باوجود ان کی شاعری پر اس ہجرت کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے کہ ان کے بیشتر موضوعات آج بھی وہی ہیں جو تلاشِ رزق کی مسافرت سے پہلے تھے۔ وہ ایک پُر خلوص اور محبت بھری شخصیت کے حامل انسان ہیں اور ان کی یہ صفات ان کی شاعری میں بھی ہمہ وقت موجود نظر آتی ہیں۔ انسانی رشتوں اور ان کے پیچ و خم پر ان کی نظر بہت گہری ہے اور وہ بہت آسان لفظوں میں گہری بات کر جاتے ہیں۔

نام کتاب: دل کی مسند / شاعرہ: ارمِ زہرا / صفحات: 176 / قیمت: 300 روپے / محمد ایوب صابر
ناشر: دُعا پبلی کیشنز، الحمد مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

اردو شاعری میں آج غزل کا دامن اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ ہر ایک موضوع پر طبع آزمائی ہو رہی ہے۔ گویا غزل بہتی ندی کی طرح اپنا راستہ خود متعین کر رہی ہے۔ اس کے باوجود غزل کا اصل وطن آج بھی رومانوی شاعری کو ہی تصور کیا جاتا ہے۔ ارمِ زہرا کا رجحان بھی غزل کے کلاسیکل رنگ کی جانب زیادہ ہے۔ ارمِ زہرا کے اشعار میں نسوانی لہجہ اپنے کمال درجے تک نظر آتا ہے۔ معاشرے میں ایک عورت کے ساتھ روا رکھی گئی صنفی تفریق اور مرد کی عورت کے بارے میں سوچ کو انھوں نے اس طرح قرطاس پر اُتارا ہے کہ ہر صنف کے لوگ اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ارمِ زہرا کبھی خود کلامی کے انداز میں اپنے ہم زاد سے ہم کلام ہوتی ہے۔ اس ہم کلامی میں کبھی اظہار ہوتا ہے اور کبھی دل کی بات زباں تک آجاتی ہے۔ وہ اپنے دل میں چھپی بات کو اس انداز میں شاعری کا روپ دیتی ہیں کہ بات قاری تک پہنچ جاتی ہے۔

نام کتاب: دریا ڈوبن چلیاواں / شاعر: نوید شہزاد / صفحات: 112 / قیمت: 200 روپے / ڈاکٹر نبیلہ رحمٰن
ناشر: مقصود پبلشرز، جیلانی سنٹر احاطہ شاہ دریاں اُردو بازار، لاہور

نوید دیاں نظماں نوں میں جدوں پڑھنی آں اوہدے علمی، فکری تے تخلیقی تجربیاں تے ہنرکاریاں دے تجزیاتی مطالعے دے ساویں ساویں ہمیش کئی منظر وی میرے سامنے آن کھلوندے نیں، ادھورے، اپورے تے کئی وار پورے منظر، ایس واری نظماں نے میری نگاہ کسے ہور پاسے جان ای نہیں دتی، سارے راہ مل کھلوتیاں۔ نظماں وگدیاں رہیاں، نظماں جھلدیاں رہیاں، نظماں ٹردیاں رہیاں، نظماں بھردیاں رہیاں، بھر بھر کے جڑدیاں رہیاں۔ پھیر جُثن لئی روح دیاں لوتھاں منگن لگیاں، تے اوہ بولیاں ماں ٹری الہودے کھوہ چوں ہن کنے کو بوکے ہور نکلن تے نظماں دی واٹ نتہاری ہووے، ہر واری قافلے والیاں دے سواگت والیوں ای سوچناواں، روکناواں اپراوہ رکدے نہیں۔ فیر ٹُرپینڈے نیں، ٹری جاندے نیں، من جنگی وچ دیھ وچا کے روز تھردے ہنجو پونجھداواں، کدی سورج بن داں، کدی انبراں دے ساہاں نوں پین داں، کدی دھرتی دے رونق رولے دیاں چپاں سیتاں ماردیاں نیں، کدی روہی دیاں راتاں دیاں چیکاں میرے سردے والاں نوں پھڑ کے راہاں وچ وگیاں نکھیاں لیکاں اُتے دھر وھنڈدیاں نیں...... ریتے اجتیاں راہاں نوں چگناواں تے کجے ہتھ چوں سپاں نوں کیلن والے پڑھے ہوئے منکے کر جاندے نیں! امنہ کڑتن نال بھر جاندا اا، پھیر منہ وچ بولدا اے، کڑتے دے بوجھے وچ میلے چوں لے کھانے تے پائے سن، نظماں نوں رنج کے مناندیاں جے ڈگے نہیں تے کوڑ دا منہ تے بھناں...... بوجھے وچ ہتھ پایا تے نال دے پنڈ دے اک ہانی دے سہرے دیاں تاراں دا گچھا وی ہتھ آ گیا، میں اوہناں نوں سورج دیاں کرناں نال اک اک کر کے ہتھ دتا اے...... ہُن میں جدوں سفراں تے نکلیا کے کولوں راہاں تے سحاں پچھن دی لوڑ نہیں ایس وار جد میرا جنم ہویا میں اپنے آپ نوں آپ ای گڑھتی دیتی اے...... میریاں ساریاں نظماں میرے تے جان گیاں، رہے اوہناں دے ناں رکھنے اوہ وی میں اپنی کنڈل جنتری چوں رکھ لاں گا۔ ''دریا ڈوبن چلیاں واں'' اوہدی نظم دا مصرع سی جس نوں اوس نے کتاب دا سرناوں متھیا۔ اصل وچ اوہ آپ ای سرناویاں ورگا اے...... حرفاں جوگا!!

نامہ ہائے احباب

مکرمی عباسی صاحب!

سلام مسنون! آپ کی عنایت سے ماہنامہ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ مئی کے شمارے میں آپ نے تبصرۂ کتب کے ضمن میں محترمہ آمنہ صدیقہ کی کتاب ''داستانِ اقبال'' پر میرے فلیپ کو بطور تبصرہ شائع کیا ہے۔ اس میں ایک ترکیب غلط شائع ہو گئی یعنی ''پا بہ جولاں'' غالباً اصل کتاب میں بھی ایسے ہی چھپی ہوگی (کتاب امروقت پیش نظر نہیں)۔ کمپوزر صاحب کی مہربانی سے ترکیب ''پا بہ جولانی''، ''پا بہ جولاں'' ہو گئی جس سے معانی کے خبط ہونے کا اندیشہ ہے۔ درخواست ہے کہ اگلے پرچے میں امر کی تصحیح یا وضاحت شائع کر دیں یا میرا یہ مکتوب شاملِ اشاعت کر لیں۔

مجھے ظفر اقبال سے عامر بن علی کا مصاحبہ پسند آیا۔ دیگر مشمولات بھی اچھے ہیں۔

مخلص اور دُعاگو

تحسین فراقی/لاہور

ڈیئر حسن عباسی!

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ارژنگ کے لیے ایک افسانہ بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گا اور جلد ہی شاملِ اشاعت ہوگا۔

بہت محبت

نیک تمنائیں

نیلم احمد بشیر/لاہور

محترم حسن عباسی اسلام مسنون

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ہم سب کا ''ارژنگ'' نثر و نظم کا نیرنگ ہم آہنگ کرنے کے ڈھنگ جانتا ہے۔ مئی کا شمارہ موصول ہوا۔ حمد و نعت سے مشامِ جاں کو معطر کر کے مضامین کے گلستان میں داخل ہوا۔ برادرم علی رضا کے اُستاد محترم سید امجد علی شاہ مرحوم پر لکھے گئے مضمون نے یادوں کے کتنے ہی دریچے وا کیے۔ سراپا محبت و شفقت سید امجد علی شاہ صاحب پر یہ تحریر نہایت پُرتاثیر ہے۔

''ہم تجھے سوچتے ہی جاتے ہیں'' میں سلیم احمد کا شعر نقل کیا گیا ہے جو میرے خیال میں یوں ہے:

ہم کو پوچھا ہمارے بعد سلیم
جیسے سوتے کو کوئی پیار کرے

متفرق شاعری میں احمد جلیل، فرخ راجا، غلام حسین ساجد اور اسلم سحاب ہاشمی کی تخلیقات دامنِ دل کو کھینچتی ہیں۔ شعری گوشوں میں جبار واصف کی کھری غزلیں قابلِ تعریف ہیں۔

حافظ مظفر محسن کا مضمون حسبِ سابق بہت اچھا ہے۔ ''ارژنگ'' کی ترقیوں کے لیے دعاگو ہوں۔

نیازکیش

واصف سجاد/ساہیوال

پیارے بھائی حسن عباسی!

السلام علیکم! اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کی محبت کے باعث ''ارژنگ'' باقاعدہ مل رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ''ارژنگ'' آپ کی قیادت میں ادبی رسائل کی اوّلین صف میں ہے۔ تمام تخلیقات آپ کے حسنِ انتخاب کی غماز ہیں۔

تازہ کلام ''ارژنگ'' کے لیے حاضر ہے قبول فرمائیے۔

والسلام

اسد اعوان

عزیزم حسن! محبتیں سمیٹتے رہو۔

''ارژنگ'' سے نوازنے کا شکریہ۔

خوب بنا سنورا ''ارژنگ'' ادبی گلکاریاں لیے ہوئے ہے۔ عامر بن علی نے ظفر اقبال کا انٹرویو کیا اور بہت خوب کیا۔ شاعر بھی بہت بڑے ہیں۔ وہ اور پھر ہم تو ان سے اس لیے بھی عقیدت رکھتے ہیں کہ میرے ہم شہر بھی ہیں۔ دعائیں

والسلام

تسنیم کوثر

برادرم حسن عباسی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

''ارژنگ'' کے لیے ایک بالکل تازہ غزل اور

احمد خیال کی کتاب پر ایک مضمون حاضر خدمت ہے۔ اگر قابل اشاعت ہوں تو ضرور حوصلہ افزائی کیجیے گا۔ ممنون احسان رہوں گا۔ آپ کی اور محترم ناز اوکاڑوی صاحب کی خدمت میں سلام۔

فقط

آفتاب خان، لاہور

بہت پیارے دوست حسن عباسی!

السلام علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ کی مجلہ ماہنامہ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے ملتا رہتا ہے۔ جس کا میں ہر دم ممنون احسان ہوں اور جواب تاخیر سے دینے پر شرمندہ ہوں۔ آپ کی عظمت اور ادبی جہاد ہے کہ ارژنگ کو تسلسل کے ساتھ قدم بہ قدم لے کر چل رہے ہیں۔ عامر بن علی کو بھی داد و تحسین جاپان میں بیٹھ کر اپنے ملک کے ادب اور ادیبوں کی خدمت میں سرگرداں ہیں۔ اللہ پاک آپ کو اجر جمیل عطا فرمائے۔

مرشدی آپ کے حکم کی تعمیل میں دو غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ گاہے گاہے شامل کرتے رہیے گا ممنون ہوں گا۔ دیگر ادبی رسائل کے مقابلے میں ارژنگ میں ایک انفرادیت پائی جاتی ہے کہ اس میں شاعری کے گوشے شامل کیے جاتے ہیں۔ قاری کو اس کا دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک تو شاعر کے رنگ ڈھنگ اور اسلوب سے آشنائی ہوتی ہے دوسرا بیک وقت اس کی کافی شاعری پڑھنے کو ملتی ہے جس سے ذوق کو تقویت بھی ملتی ہے اور مہمیز بھی اور ذوق کی تشفی بھی۔ حصہ نثر بھی اپنی مثال آپ ہے اور اچھے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ بہت سی دعائیں حسن عباسی کے لیے۔

والسلام

آپ کا دوست

راؤ وحید اسد

ملتان

عزیز محترم جناب حسن عباسی صاحب!

آداب و تسلیمات۔ امید ہے مزاج الخیر ہوں گے۔ سب سے پہلے تو میں انتہائی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے میری شاعری پرچے میں لگانے کے قابل بھی۔ بڑا امید ہوں کہ یہ کرم نوازی آئندہ بھی جاری رہے گی۔ مارچ 2016 کا ''ارژنگ'' بدست جناب ناز اوکاڑوی صاحب وصول کیا۔ خوبصورت ٹائٹل پر خوبصورت پیرائے میں پتلیاں دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ بچپن میں بڑے ذوق و شوق سے ان کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔ اداریے میں ذکر مرحومین سے اپنے ساتھ مجھ کو بھی رلا دیا۔ خدا ان سب کو غریق رحمت فرمائے آمین ''بچھڑنے والوں کے نام'' بے حد دل گداز اور پرسوز نظم تھی۔

حمد و نعت میں تمام شعرا کرام نے اپنے اپنے انداز میں ثنائے ربی و نبی ﷺ کی خدا ان سب کی کاوش و عقیدت قبول و مقبول فرمائے۔ آمین

غزلوں نظموں پر کیا لکھوں ایک سے بڑھ کر ایک یہ آپ کے ادبی ذوق و معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کہانیاں، افسانے، افسانچے، کتب پر تبصرے، انٹرویو، سب کے سب عمدہ دلچسپ اور معیاری تحریریں تھیں۔ اس دعا کے ساتھ کہ اب سائیں آپ اور آپ کے تمام چاہنے والے دوست و احباب کو اپنی امان میں رکھے اور ''ارژنگ'' آسمان ادب پر یونہی ضوفشاں رہے۔

آمین ثم آمین

سید محمد سعید

لاہور

جناب حسن عباسی صاحب!

مدیر ماہنامہ ارژنگ، لاہور

السلام علیکم۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ انٹرنیٹ پر ماہنامہ ارژنگ کے شمارے نظر سے گزرتے رہتے ہیں کہ ڈاؤن لوڈ فارم میں با آسانی دستیاب ہیں۔

اپنی ایک غزل اور دو مختصر نظمیں ای میل کر رہا ہوں۔ ارژنگ جیسے خوبصورت اور معیاری ادبی جریدے میں چھپنا میرے لیے باعث اعزاز ہوگا۔ امید ہے کہ آپ میری تخلیقات کو ارژنگ کے آئندہ شمارے میں شامل کر کے ممنون فرمائیں گے۔ شکریہ

امر مکی (محمد حنیف)

تحصیل حضرو، ضلع اٹک

طنز و مزاح کے اکھاڑے میں لنگوٹ کس کے اترنا اتنا آسان کام نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر اصنافِ ادب کے برعکس بہت کم لوگوں نے اس صنف کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کوشش کی۔ جو میدان میں اُترے ان میں سے بھی بیشتر اس صنف کو پچھاڑنا تو درکنار اس کی "دُبنی" پکڑنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ طنز و مزاح کے میدان میں شاعروں کی طرح لاکھوں کا مجمع نہیں ہے۔ بلکہ جو نیا دیوانہ آتا ہے جلد پہچانا جاتا ہے اور اُسے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے کہ آخر اس خارزار میں کسی نے تو قدم رکھا۔ حافظ مظفر محسن بھی ہمارے قبیلے کا ایک فرد لگتا ہے۔ وہ ایک عمدہ مزاح نگار ہے۔ ملاقات سے پہلے اخبارات کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی کبھار مظفر محسن کی کوئی تحریر نظر سے گزر جاتی۔ وہ تحریر نہ تو مکمل طنز و مزاح کے زمرے میں آتی اور نہ ہی سنجیدہ نثر کے زمرے میں بلکہ ان دونوں کے مابین وکھری ٹائپ کی کوئی تحریر ہوتی۔ مظفر محسن سے جب دو چار ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ وہ صرف شگفتہ نثر ہی نہیں لکھتا بلکہ طنزیہ جملوں کے تیر برساتا، شرارتیں اور چھیڑ خانیاں بھی کرتا ہے۔ حافظ مظفر محسن کی تحریر میں اس کی شخصیت کے یہ پہلو جھلکتے ہیں۔ لہٰذا اس کی تحریر پڑھ کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ روزمرہ کے واقعات کو موضوعِ سخن بناتا اور ہمارے ارد گرد پھیلے کرداروں کو تحریر میں لا کھڑا کرتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان سے چھیڑ خانیاں اور مستیاں کر کے پھر ان سب کو باعزت بری بھی کر دیتا ہے۔ حافظ مظفر محسن کو مزاح لکھنے کا حق اس لیے بھی حاصل ہے کہ اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ ہر وقت پھیلی رہتی ہے جو کہ فی زمانہ کسی صدقہ جاریہ سے کم نہیں۔ مجھے یہ شخص پسند ہے کیونکہ وہ ایک سچا اور مخلص انسان ہی نہیں بلکہ ایک شگفتہ اور جینوئن مزاح نگار بھی ہے۔

عطاء الحق قاسمی

ممتاز ادیب اور مزاح نگار

حافظ مظفر محسن

کی طنز و مزاح پر مشتمل کتاب

"بونا نہیں بے وقوف"

کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

برطانیہ (نوٹنگھم) میں مقیم معروف شاعرہ، ناول نگار اور افسانہ نویس

سعدیہ سیٹھی

کی کتابیں

- کبھی ناراض مت ہونا (شعری مجموعہ)
- تنہائیاں (شعری مجموعہ)
- محبت آخری سچ ہے (ناول)
- پہیلیاں (بچوں کے لیے)

شائع ہو گئی ہیں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3731963
nastalique786@gmail.com

ہر طرف گہرا دھواں ہے اور میں
اک نیا پھر امتحاں ہے اور میں

چاند ہیں حد نظر تک آنکھ کے
آنسوؤں کی کہکشاں ہے اور میں

رسم دنیا کے تقاضے اور ہیں
کیا کروں کہ دل جواں ہے اور میں

لاکھ اندیشے کروڑوں وسوسے
جانے کیا ہے کیا گماں ہے اور میں

آنچل اوڑھے چل رہی ہوں اس کے ساتھ
سر پہ بوڑھا آسماں ہے اور میں

موت ہی لگتی ہے امید بہار
زندگی بھر کی خزاں ہے اور میں

سامنا ہے پھر نئی اک جنگ کا
سعدیہ پھر خانداں ہے اور میں

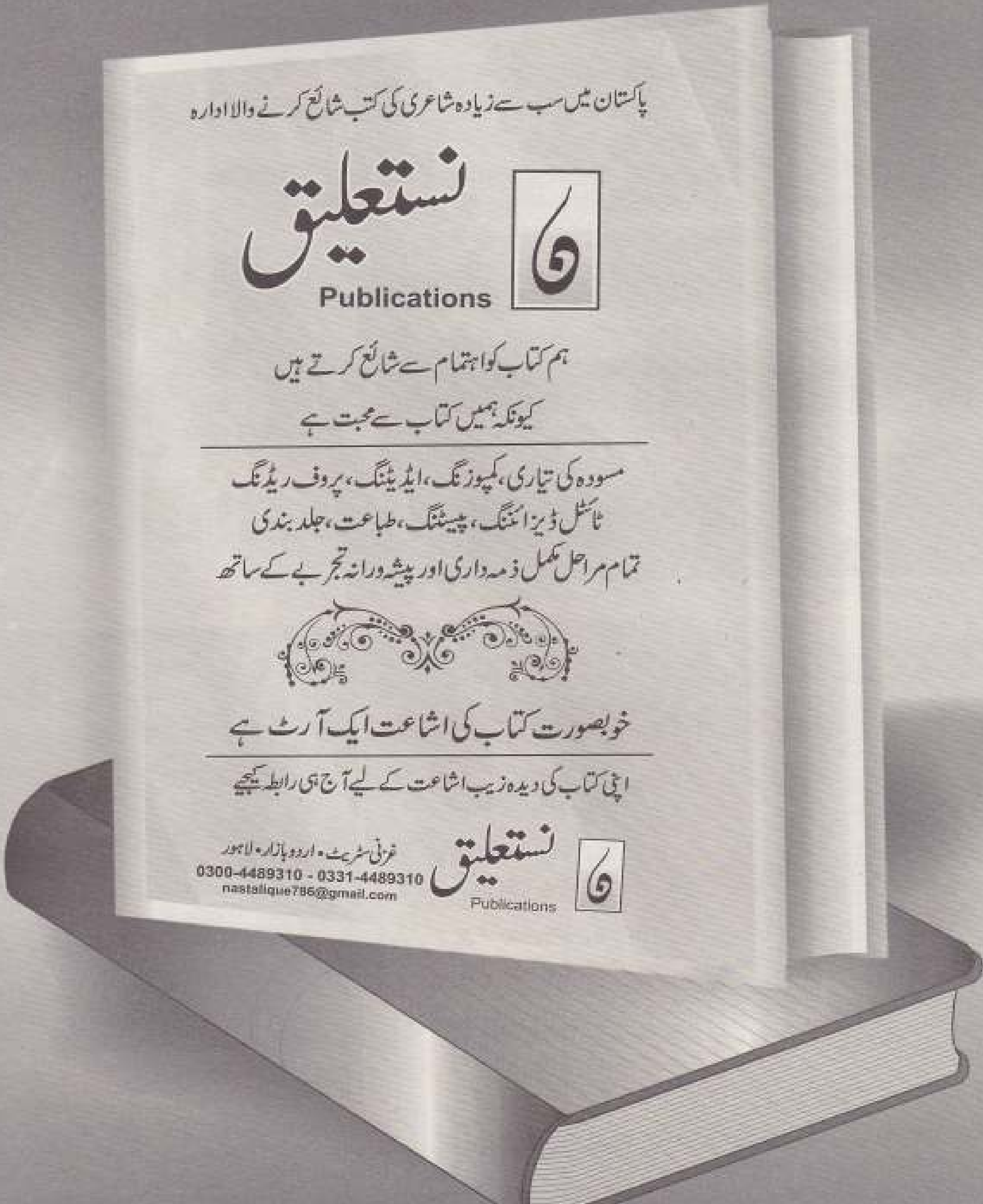
پاکستان میں سب سے زیادہ شاعری کی کتب شائع کرنے والا ادارہ
نستعلیق
Publications
ہم کتاب کو اہتمام سے شائع کرتے ہیں
کیونکہ ہمیں کتاب سے محبت ہے
مسودہ کی تیاری، کمپوزنگ، ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ
ٹائٹل ڈیزائننگ، پیسٹنگ، طباعت، جلد بندی
تمام مراحل مکمل ذمہ داری اور پیشہ ورانہ تجربے کے ساتھ
خوبصورت کتاب کی اشاعت ایک آرٹ ہے
اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے آج ہی رابطہ کیجیے
نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

نامور ادیب اور کالم نویس **رئیس عباس زیدی** کی شہرہ آفاق کتابیں

نستعلیق
Publications

رئیس عباس زیدی نے گورنمنٹ ڈگری کالج سے بی ایس سی کی۔ پنجاب یونیورسٹی کے انگلش ڈیپارٹمنٹ سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ پھر برطانیہ کی یونیورسٹی سے ایم اے کر لیا۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ خاصی حد تک مکمل ہو گیا تھا مگر لیکن سول سروس کی اسیری کی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ یونائیٹڈ بنک کے لیے آغا حسن عابدی کی ٹیم نے منتخب کر لیا مگر جلد ہی اس "صحبت ناجنس" سے استعفیٰ دے دیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سول سروس کا امتحان پاس کر کے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں سروس شروع کی۔ سروس کے پہلے آٹھ سال صوبہ سندھ اور بقیہ نوکری صوبہ پنجاب میں گزری۔ اسسٹنٹ کمشنر، ڈپٹی کمشنر و ڈی سی او۔ دو کارپوریشنوں کے چیف ایگزیکٹو اور پانچ صوبائی محکموں کے سیکرٹری رہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے آخری اہم پوسٹنگ سیکرٹری محکمہ صحت پنجاب تھی۔ آج کل یونیورسٹی آف لاہور میں پرو ریکٹر اور شعبہ انگریزی ادب کے سربراہ ہیں۔ تمام عمر شعر و ادب اور صحافت اوڑھنا بچھونا رہا۔ زیر مطالعہ کتاب ان کے روزنامہ "جہان پاکستان" میں شائع ہونے والے کالموں کا انتخاب ہے۔

نامور شاعر **احمد سبحانی آکاش** کے شعری مجموعے

آئینہ جس جگہ سے آیا ہے
عکس بھی چاہیے وہیں کا مجھے

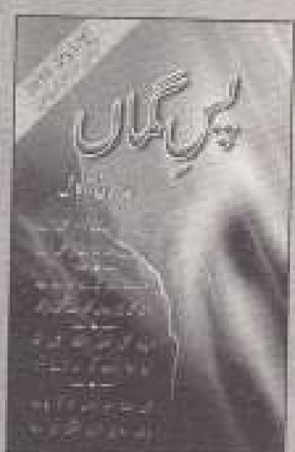

2010

2000

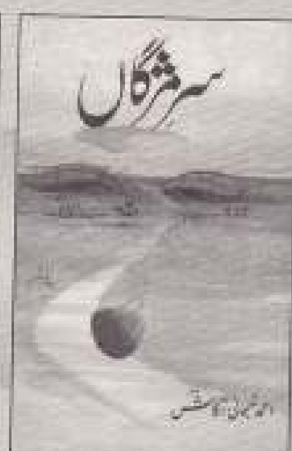

1998

ملنے کا پتہ: "ماورا" شاہراہ قائداعظم لاہور

ممتاز شاعرہ اور کالم نویس

ڈاکٹر صغریٰ صدف

کے شعری مجموعے

وعدہ

کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

عمان (مسقط) میں مقیم نوجوان شاعر

قمر ریاض

کے پہلے شعری مجموعے جیون، تتلی اور میں کا دوسرا ایڈیشن
اشاعت کے مراحل میں

عشق میری حیات ہو جیسے
یہی کل کائنات ہو جیسے

وہ سمجھتا ہے بھول جانا مجھے
عام سی کوئی بات ہو جیسے

ایسا لگتا ہے زندگی کا سفر
کوئی لمبی سی رات ہو جیسے

دل کے یوں ٹوٹنے سے لگتا ہے
ہو گئی میری مات ہو جیسے

میں کہاں اور وہ کہاں ہے قمرؔ
پھر بھی لگتا ہے ساتھ ہو جیسے

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

میں آج تک اپنی کسی تخلیق سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکا

غزل کو جو مزاج شکیب جلالی اور ظفر اقبال نے دیا وہ ہمارے زمانے کا اجتماعی لہجہ قرار پایا

برطانیہ میں مقیم نامور شاعر اور کالم نویس

منصور آفاق

سے حسن عباسی کی گفتگو

ماہنامہ ارژنگ لاہور
جولائی 2016ء

ادب میں محاذ آرائی مثبت عمل ہے۔ ادیبوں میں محاذ آرائی منفی عمل ہے

ارژنگ: آپ بیک وقت شاعر، کالم نویس، ڈرامہ رائٹر اور ناول نگار ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان اصناف کے ساتھ آپ انصاف کر پائے ہیں؟

منصور آفاق: "چراغ جب کمرے میں جلتا ہے تو اس کی روشنی مختلف چیزوں سے ٹکرا کر مختلف شیڈز بناتی ہے اب کونسا شیڈ زیادہ خوبصورت ہے اس کا فیصلہ تو آنکھ کرتی ہے چراغ نہیں"

ارژنگ: آپ کی شاعری پڑھ کے لگتا ہے آپ روایتی غزل سے غیر مطمئن ہیں اور جدید غزل میں لفظیات، مضامین اور ردیف قافیہ کی سطح پر نت نئے تجربات کرتے رہتے ہیں کیا ہمارے بعض ناقدین کی طرح آپ بھی روایتی اردو غزل کو مردہ سمجھتے ہیں؟

منصور آفاق: "قطعاً نہیں روایتی شاعری ہی اس وقت تک اردو زبان کی بڑی شاعری ہے۔ مگر یہ طے شدہ بات ہے کہ یہ ماضی سے متعلق ہے اور میں حال کی بڑی شاعری کی تلاش میں نکلا ہوا مسافر ہوں"

ارژنگ: ظفر اقبال نے غزل میں زبان کے حوالے سے جو تجربات کیے کیا آپ ان کو درست سمجھتے ہیں یا اپنے تجربات کو؟

منصور آفاق: "اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر اقبال نے ایک نیا راستہ دکھایا۔ اس راستے پر کون کس طرح سفر کرتا ہے یہ اپنی اپنی ہمت کی بات ہے"

ارژنگ: کیا آپ اردو میں 70 کی دہائی کے بعد لکھی جانے والی نظم کو زیادہ توانا سمجھتے ہیں یا غزل کو زیادہ مضبوط گردانتے ہیں؟

منصور آفاق: "ستر کی دہائی کہیں یا اس سے تھوڑا سا پہلے۔ نظم اور غزل دونوں میں حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ نظم کو جو نیا موڑ مجید امجد نے دیا اس پر کئی نئی بستیاں آباد ہو گئیں اور غزل کو جو مزاج شکیب جلالی اور ظفر اقبال نے دیا وہ ہمارے زمانے کا اجتماعی لہجہ قرار پایا"

> میں حال کی بڑی شاعری کی تلاش میں نکلا ہوا مسافر ہوں

ارژنگ: شاعری کے فروغ میں مشاعرے کا کیا کردار ہے؟

منصور آفاق: ماضی میں بہت زیادہ تھا جب ذرائع ابلاغ محدود تھے۔ اب اس کی حیثیت ایک کلچرل ایونٹ کی ہے"

ارژنگ: دیوان منصور کا خیال کیسے آیا؟

منصور آفاق: "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے"

ارژنگ: آپ نے استغاثہ کے عنوان سے طویل نظم لکھی پھر غالباً 1000 صفحات پر مشتمل ناول لکھا مگر دونوں کتابیں کئی برسوں سے شائع نہیں ہوئیں۔ کیا آپ اپنی تخلیقات سے غیر مطمئن رہتے ہیں؟

منصور آفاق: "میں آج تک اپنی کسی تخلیق سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکا"

ارژنگ: آپ ادب میں اور ادیبوں میں محاذ آرائی کی سیاست کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

منصور آفاق: "ادب میں محاذ آرائی مثبت عمل ہے ادیبوں میں محاذ آرائی منفی عمل ہے"

بقیہ اندرونی صفحات

ادب سرائے انٹرنیشنل کے زیر اہتمام

محفلِ مشاعرہ و تقریب تقسیم ایوارڈز

صدارت: مشکور حسین یادؔ • مہمانِ خصوصی: عامر بن علی • نظامت: سفینہ چوہدری • میزبان: ڈاکٹر شہناز مزمل

پاکستان کے نامور شعراء اور ادباء کی کثیر تعداد نے اس تقریب میں شرکت کی

عامر بن علی ایوارڈ برائے 2015 مشکور حسین یادؔ اور شہناز مزمل سے وصول کرتے ہوئے۔

امریکہ میں مقیم شاعرہ مامون ایمن کو ڈاکٹر شہناز مزمل ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔

اسٹیج کا ایک منظر

ڈاکٹر شہناز مزمل ادب سرائے لائبریری کا معائنہ کروانے کے بعد شعراء کے ساتھ

Gull

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com